آئینے کے زندانی

آصف رضا

asif.raza38@gmail.com

آئینے کے زندانی

آئینے کے زندانی

آصف رضا

پرنٹاس پبلیشر، کراچی۔ پاکستان

کتاب : آئینے کے زندانی
مصنف : آصف رضا
مطبع : پرنٹاس پرنٹنگ سروسز، کراچی
ناشر : پرنٹاس پبلیشر
۵۔ کریم مارکیٹ، ناظم آباد نمبر ۲، کراچی۔ پاکستان

Aa'ine ke Zindani

By Asif Raza

asif.raza38@gmail.com

First Edition : 2015 by M. R. Publications, New Delhi, India.

ISBN: 978-969-7622-01-6

Second Edition : 2015

Price: Rs. 300/-
Library Edition: Rs. 450/-

Printed & Published by

Printas Printing Services

No.5, Karim Market, Nazimabad No. 2,
Karachi. Pakistan

Cell: 0300-9278869, 0335-2924993 E-mail: salisarwar@live.com

انتساب

اس کے نام جو ہر کہیں ہے لیکن کہیں نہیں

فہرست

طوطی پس آئینہ: آصف رضا کی نظمیں

شمس الرحمٰن فاروقی

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

آصف رضا کی ان نظموں میں متکلم، یا ان نظموں میں جو کردار نظر آتے ہیں، آئینے کے زندانی صرف اس معنی میں نہیں ہیں کہ انھیں اتنی ہی حقیقت نظر آتی ہے جتنی وہ اپنی ذات کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ یا یوں کہیں کہ وہ بھی اتنے ہی غیر حقیقی ہیں جتنی وہ شبیہیں جن کو وہ آئینے میں دیکھتے ہیں۔ افلاطونی ظلال کے باہر کچھ نہیں ہے، اور اگر ہے بھی تو وہ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ لیکن 'آئینے کا زندانی' ایک اور معنی بھی رکھتا ہے۔ اس کی طرف حافظ کے شعر میں اشارہ ہے جو میں نے اوپر نقل کیا۔ نوگرفتار طوطی کے سامنے آئینہ رکھ دیتے ہیں اور آئینے کے پیچھے طوطی کو سکھانے والا بیٹھا رہتا ہے۔ وہ کبھی طوطی کی آواز میں بولتا ہے، کبھی انسان کی آواز میں۔ طوطی کو آئینے میں جو عکس نظر آتا ہے وہ اسے ایک اور طوطی سمجھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ آوازیں اسی طوطی کی ہیں جسے وہ آئینے میں دیکھ رہا ہے۔ وہ منعکس طوطی کی آوازوں کی طرح آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح وہ بولنا سیکھ جاتا ہے۔ یعنی طوطی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کی اپنی آواز نہیں ہے، وہ آئینے میں اپنے عکس کا قیدی ہے۔ اور لطف یہ ہے پس آئینہ جو ہے وہ بھی اپنی بولی نہیں بول رہا ہے۔ وہ تو وہی بولے گا جس کے لئے اسے حکم ہے کہ طوطی کو یہ کہنا سکھاؤ، یہ کہنا سکھاؤ۔

اس طرح طوطی کا عکس ہی اصل طوطی ہے، کہ اس کے بغیر ہمارا نوگرفتار طوطی کچھ بول نہ سکتا۔ اور یہ بھی ہے کہ آئینے میں جو صورت بند ہے وہ بہر حال صرف ایک عکس ہے۔ لہٰذا 'آئینے کے زندانی' میں خود ہی آئینہ گھر کی سی کیفیت ہے۔ اور یہ نظمیں بھی بظاہر یہی کہنا چاہتی ہیں کہ ہم

حقیقت کا اظہار ہیں تو سہی، لیکن یہ حقیقت خود ایسی ہے کہ اسے کہیں پر قرار نہیں۔ ہر شے ایک شے بھی ہے اور ایک عکس بھی ہے اور شاید ہر عکس کے کئی اور عکس بھی ہیں۔ ان باتوں کی مختصر وضاحت کے لئے آصف رضا کی ایک مختصر سی نظم ملاحظہ ہو:

خوں رنگ کلی

تلوار نما

پیڑ کی جڑ تک

چیخ خزاں کی جب اتری

تو شاخ خشک نے پیدا کی

ضبط جو اس نے اپنے اندر کر رکھی تھی

اک خوں رنگ کلی

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ یہ نظم تحسین سے زیادہ غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے۔ اور یہ بات ذرا غیر معمولی سی ہے، کیونکہ اس زمانے میں ایسے لوگ کم ہیں جو آپ کو مجبور کریں کہ ہمیں لطف کی خاطر نہ پڑھو، کچھ سمجھنے کی خاطر پڑھو۔ ان دنوں ہمارے یہاں زیادہ تر نظمیں ’حالات حاضرہ‘ پر محفوظ (یعنی غیر متنازعہ فیہ) تبصرہ کرنے، جانی بوجھی باتوں کو موزوں عبارت میں لکھ دینے، یا پھر اپنی کسی چھوٹی موٹی پریشانی یا الجھن کو بیان کرنے کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ ایسی نظمیں کامیاب ہیں یا ناکام، یہ سوال کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہاں کامیابی سے مراد ہے، سستے چھوٹ جانا، کوئی ایسی بات نہ کہنا جو ذہن میں خلش یا خلفشار پیدا کرے۔

بات یہ ہے کہ آج کے زمانے میں شعرا بہت بے صبر ہو گئے ہیں۔ وہ بے چین ہیں کہ اپنی بات جلد از جلد کہہ جائیں۔ شاید انھیں خوف ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو لوگوں کی توجہ ان کے بجائے کسی اور طرف مبذول ہو جائے گی۔ بہت کچھ جلد سے جلد کہنے کی کوشش میں استعارہ شاعر کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ استعارہ، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، دو مختلف چیزوں میں مماثلت، یا مماثلت کے پہلو ڈھونڈنے کا عمل ہے۔ آصف رضا کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اشیا کے آر پار نہیں بلکہ ان کے پیچھے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی نظم میں غیر متوقع، یعنی استعاراتی باتوں

کا وفور ہے اور یہی وفور ہمیں نظم پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں کوئی بات بے پردہ نہیں ہے، ہر بات کو کسی اور پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔

خزاں کی تلوار نما چیخ کا کام تو یہ تھا کہ وہ درخت کی جڑ تک کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی، لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ خشک شاخ میں ایک کلی پھوٹ آئی۔ کیا یہ کلی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خزاں کی چیخ نے کچھ الٹا ہی کام کیا؟ یا پھر یہ کلی خون کی علامت ہے، یا خون آلودہ جوانی کی، جس نے خزاں سے بچنے کے لئے پیڑ میں پناہ لی تھی (جس طرح حضرت زکریا پیغمبر نے ایک پیڑ کے تنے میں پناہ لی تھی، لیکن وہاں بھی وہ دشمنوں سے بچ نہ سکے تھے۔) فرق یہ ہے کہ اس خوں رنگ کلی نے احتجاج کے طور پر، یا زندگی کی علامت کے طور پر، خزاں کی تلوار کا الٹا ہی اثر لیا اور وہ اس شاخ کی کوکھ سے باہر نکل آئی جہاں اسے شاخ خشک نے ضبط کر رکھا تھا۔ تو کیا خزاں کی تیز دھار کا ہونا ضروری تھا؟ یعنی قوت نمو کا تقاضا یہ تھا کہ وہ تیز تلوار درخت کی جڑ تک پہنچتی اور اس بہانے زندگی کو دوبارہ جنم لینے کا موقع ملتا؟ یا پھر کیا کلی کا 'خوں رنگ' ہونا موت اور اختتام کی علامت ہے؟ خون سے زندگی ہے اور خون کو موت کا مترادف بھی کہہ سکتے ہیں، اور خون کا نہ ہونا بھی موت کی علامت ہے۔ اقبال کا مصرع یاد آتا ہے ؎

کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

لیکن 'خوں رنگ کلی' میں 'خون' اثبات حیات کا بھی استعارہ ہے، صرف موت کا نہیں، جیسا کہ اقبال کے یہاں ہے۔ یا پھر مصحفی کا شعر ہے جس میں 'خون' اور 'رنگ' دونوں موجود ہیں۔ 'رنگ' کے ایک معنی 'طاقت' بھی ہیں، یہ ملحوظ رہے ؎

دیا فشار مرے دل کو عشق نے یاں تک

کہ اس میں خون تو کیا رنگ آرزو نہ رہا

ابھی ہم نے 'خزاں کی چیخ' پر غور نہیں کیا ہے۔ یہ تلوار کی شکل کی تھی، یعنی تیز، تھوڑی سی خمیدہ، چمک دار، لیکن 'چیخ' کیوں؟ کیا یہ خزاں کی آخری چیخ تھی اور تلوار جیسی اس کی تیزی ایک طرح سے اس کی موت کے پہلے کا سنبھالا تھی؟

چھوٹی سی نظم ہے اور کئی امکانات ہیں۔ اس طرح کی نظمیں ماہرانہ چابک دستی اور فکری

گہرائی کے اتصال کا نتیجہ کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن فکر کی گہرائی ایک طرح کی بھول بھلیاں نہیں تو ایک محور ضرور ہے۔ جس کے گرد امکانات کے دائرے گردش کرتے ہیں۔ کیفیت، یا جذباتی ابال یا ردعمل پر مبنی نظم میں کشش (یا عام زبان میں، خوبصورتی) تو بہت ہوتی ہے لیکن امکانات نہیں ہوتے۔ دودھ کے ابال یا بھاپ کی اڑان کی طرح جو کچھ بھی ہوتا ہے سامنے ہوتا ہے اور وقتی ہوتا ہے۔ آصف رضا کی نظم میں ہم ہمیشہ کئی امکانات، فکر یا معنی کی کئی جہتوں سے دوچار رہتے ہیں۔

'زہرہ دیوی' نامی سلسلۂ نظم میں یہ بات بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے کی دوسری ہی نظم دیکھیے:

برف پہاڑوں کی پگھلی ہے
گرمائی خطوں سے بدر
لوٹ رہے ہیں آبی طائر اپنے گھر
میں چھوڑ کے اپنی دنیا کو
تیری طرف کرتا ہوں سفر
زہرہ دیوی

تیری قلمرو کی سرحد پر آہ مگر
ہے برف جمی
میرے آگے سینہ تانے
برفانی تودے ہیں کھڑے

کہرے سے ڈھکی اس وادی میں
میں تجھ کو پکارتا ہوں لیکن
میری صدا کو دہرا کر
کہسار مجھے لوٹاتا ہے

اس سناٹے سے خوف مجھے آتا ہے

ہے دور افق پر اک برفانی چوٹی جو
نظروں سے مری اوجھل ہوتی ہے
اور نہ قریب آتی ہے
اوٹ سے اس کی رہ رہ کر
جو اک نیلی روشنی پھوٹتی ہے
کیا وہ تو ہے جو مجھ کو بلاتی ہے؟

مسحور تجلی سے تیری
میں... تیرا جوئندہ
آیا ہوں پیچھے چھوڑ کے اپنی دنیا کو
یہ سوچ کے ڈرتا ہوں کہ کہیں
تو صرف مری بیدار آنکھوں کا خواب نہ ہو

نظم میں کئی دنیائیں ہیں: پرندے، جو اپنی زندگی ایک دنیا سے دوسری دنیا کو سفر کرتے ہیں، سردی سے گرمی کی طرف، گرمی سے سردی کی طرف۔ لیکن ان کی ایک دنیا سفر اور مسافت کی دنیا بھی ہے کہ بسا اوقات یہ پرندے کئی کئی ہفتے صرف سفر میں بسر کر دیتے ہیں۔ اور اس طویل کے سفر کے دوران کئی پرندے اپنی جانیں بھی کھو دیتے ہیں۔ عنوان بھی کئی دنیاؤں (اور اس طرح کئی معنی) کا غماز ہے۔ 'زہرہ' کے ساتھ 'دیوی' کا تصور کسی رقاصہ، یا مغنیہ کی طرف اشارہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو رومائی دیومالا کی دیوی Venus کی طرف خیال جانا لازمی ہے۔ وینس کو ہمارے یہاں 'زہرہ' اور 'رقاصۂ فلک' یا 'لولی فلک' کہتے ہیں۔ یونانی دیومالا میں وہ حسن اور عشق (خاص کر جسمانی عشق) کی دیوی ہے۔ ہمارے یہاں زہرہ وہ رقاصہ بھی ہے جس کے عشق نے ہاروت اور ماروت نامی فرشتوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی واقعی، گوشت پوست کی

معشوقہ ہو جسے متکلم (یا شاعر) نے زہرہ دیوی کا نام دے دیا ہے۔

ہر صورت میں زہرہ (کوئی دیوی، کوئی رقاصہ، کوئی حقیقی معشوقہ، کوئی فرضی اور تصوراتی ہستی) اس قدر قوت مند ہستی ہے کہ متکلم اسے کسی برفانی چوٹی کے روپ میں دیکھتا ہے جس کے پیچھے سے نیلی روشنی سی پھوٹتی محسوس یا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن متکلم، جس نے 'اپنی دنیا' کو تیاگ دیا ہے کہ زہرہ دیوی کو حاصل کر سکے، ہر لحظہ شک میں مبتلا ہے (کیا وہ تو ہے، جو مجھے بلاتی ہے؟) اور یہ شک اپنی انتہا کو پہنچ کر خوف میں بدل جاتا ہے:

یہ سوچ کے ڈرتا ہوں کہ کہیں
تو صرف مری بیدار آنکھوں کا خواب نہ ہو

ہر چند کہ یہ امکان پھر بھی باقی رہتا ہے کہ متکلم، یا زہرہ کی جستجو میں جنگل پہاڑ بیابانوں کی خاک چھاننے والا شخص، درحقیقت اپنی منزل کو پا بھی سکتا ہے، لیکن آصف رضا اس امکان کو قوت سے فعل میں نہیں آنے دیتے۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے کہ ہمارے سامنے صرف 'زہرہ' رہ جاتی ہے، دیوی، یا ستارہ، یا رقاصہ، یا گوشت پوست کی لڑکی۔

'دارا شکوہ' بظاہر ایک رنجیدہ، بلکہ برہمی اور المیہ رنگ لئے ہوئے خود کلامی ہے۔ دارا شکوہ کی زندگی اور موت کے بعض واقعات کی طرف واضح اشارے کرتی ہوئی نظم ہمیں ایک غیر متوقع، بلکہ اچنبھے سے بھرپور موڑ پر لے آتی ہے اور ہم پھر حقیقت، توہم، مفروض اور معروض کے سوالوں میں گھر جاتے ہیں:

جو چمکا تھا آنکھیں اس کی خیرہ کرتا
کیا تھا نور خدا؟
یا تھی فقط تیغ براں؟
تھال میں کیا زریں سرپوش تلے
اس کا سیاہی مائل تھا چہرہ؟
(کیا کلمہ تھا ناگفتہ
اس کے لبوں پر خوں بستہ؟)

فانوسِ گردو خاک میں یا اپنے سر سے کٹ کر
روشن تھا صوفی کا سر؟

یہاں نہ صرف یہ کہ سرمد اور داراشکوہ آپس میں ضم ہوتے نظر آتے ہیں، بلکہ یہ بھی فکر بھی پیدا ہوتی ہے کہ اصل حقیقت (یا 'حق') کیا ہے اور کس کے ساتھ ہے؟ شاعر کی اپنی آواز مدھم، بلکہ پس منظر سے بھی پرے معلوم ہوتی ہے اور نظم کا بیان کنندہ شاید کوئی داستانی شخص بھی نہیں بلکہ کوئی غیبی ہستی ہے جو داراشکوہ کی صوفیانہ عقیدت مندی اور بادشاہی کی توقعات کو کو تھوڑے بہت استہزا کے ساتھ دیکھتی ہے:

خوشبودار دھوئیں والا
اپنا مرصع نے کا حقہ پی
اپنے پیر کے پیر دبا
یا اس کی تھوکی لونگ چبا لیکن
مت خونیں شطرنج بچھا
یہ بازی تیرے بس کی نہیں
ناداں! ہر جائے گا!

یہ صرف

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیالست و محالست و جنوں

کا معاملہ نہیں ہے۔ انسانی دنیا (اور شاید اوپر والوں کی دنیا میں بھی) کوئی منطق نہیں۔ دو اور دو کی جمع چار ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ ہمیں سکھایا گیا تھا کہ

گندم از گندم بروید جوز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

لیکن داراشکوہ ہو یا سرمد، ان سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ یہی دنیا دارالعمل بھی ہے اور دارالمکافات بھی۔ اقبال کے لینن نے بے صبر ہو کر خدا سے شکایت کی تھی

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

آصف رضا کی نظم 'داراشکوہ' کا (غیبی، یا فرضی) راوی ہم سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ مکافات بھی کسی مطلق صورت یا کیفیت کا نام نہیں۔ چنانچہ 'داراشکوہ' یوں ختم ہوتی ہے:

ایک شکستہ مرقد پر

اونچا جیسے فتح کا پرچم لہراتا

اک سرسبز شجر

چھاتی میں زمیں کی پنجہ گاڑے

اس کی جڑیں

اور رس ریشے شریان نما

ہیں زیریں تاریکی میں اس کی رواں

کالے پانی کی جھیلیں

اور آویزاں ہیں شاخوں کی محرابوں میں

پھول کہ جو روشن ہیں

جیسے قندیلیں

دوشِ ہوا پر پھیلتی ہے ان سے اٹھ کر ہر سو

اک سڑتے لاشے کی بو

قندیلوں کی طرح روشن پھول تو ہیں، لیکن ان کی مہک مردار جیسی ہے اور اوپر سرسبز شجر جیسا پرچم ہے جو فتح کا نشان سمجھا جا سکتا ہے۔

کائنات کا یہ تصور ہزار رنج افزا اور ہمت شکن سہی لیکن ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے پاس جو تصور ہے (اگر کوئی ہے بھی) ہم اس کے لئے منطقی صداقت کا دعویٰ نہیں کر سکتے ؏ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

نظموں کے اس مختصر سے مجموعے میں ہر نظم ایسی ہے جو توجہ کو کھینچتی ہے، غور وفکر کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن ایک نظم 'جواں مرگ' ایسی ہے جہاں غم اور غصہ ہر شے پر حاوی ہیں، پوری کائنات پر حاوی ہیں۔ 'جواں مرگ' ایک نوجوان لڑکی کا مرثیہ ہے، یا افسانہ ہے، یا سوانح حیات ہے، یا داستان ہے۔ جوان ہوتی ہوئی، ایک گھریلو، روزمرہ، ہم لوگوں جیسی زندگی گذارتی ہوئی ایک لڑکی جو کراچی میں، یا کسی بھی شہر (مثلاً موصل) میں مسلکی تشدد کی بھینٹ چڑھ گئی۔ نظم کے شروع میں تو ہمیں بہلایا جاتا ہے کہ اب وہ ستاروں اور فرشتوں کے درمیان ہے اور وہاں اس نے اپنی حقیقت کو پالیا ہے:

وہ تھی جو رفعت کی طالب
قربِ فلک میں پہنچی تو
تاروں نے اس کو جھک کے لیا
اپنی درخشاں بانہوں میں
اور روح روشن اپنی اس کے قالب میں پھونکی
اب قوسِ قزح کے رستے پر دیکھو
وہ جگمگ جگمگ کرتی ہے

...

خود یافتہ ہے وہ اب اس عالم میں
جو لامحدود ارواح کا عالم ہے
اب کاہکشاں سیار و ثوابت کا باطن
اس کے باطن میں شامل ہے
تاروں کے نغمے اب اس کے
شفاف گلے میں گونجتے ہیں

لیکن موت اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ موت کی حقیقت زندگی کی طرح نہیں کہ آن کی آن میں ختم ہو جائے۔ موت اور خاص کر ناوقت، جوان اور بے سبب موت سب کو

غیر مطمئن رکھتی ہے، زندہ رہنے والوں کو بھی اور مرنے والوں کو بھی:

جب چاند فلک پر پورا ہوتا ہے
تو اس کی جسم بدر چھایا
قبر پہ جھک کر اپنا کتبہ پڑھتی ہے
اور بلند آواز سے گریہ کرتی ہے

...

منظور نہیں اس کو اپنا
اس دنیا میں نہ ہونا
سائے میں مبدل دیکھ کے خود کو ڈرتی ہے

...

ہر صبح کے آئینے میں دیکھنا چاہتی ہے وہ منھ اپنا
اتنا ہی حسیں جتنی وہ تھی

نظم کے انجام میں 'شعلۂ عشق' کے انجام جیسی شدت اور خوف انگیزی ہے:

کہ ہو کر فروغ اک سوے آسماں
تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں
لب آب وہ شعلۂ جانگداز
تڑپ کر بہت بازبان دراز
پکارا کہاں ہے پرس رام تو
محبت کا ٹک دیکھ انجام تو
کہ میں جملہ تن آتش تیز ہوں
دل گرم سے شعلہ انگیز ہوں
بھڑکتی ہے جب آگ دل میں مرے
لب آب اتروں ہوں غم میں ترے

سو یہ آب رکھتا ہے روغن کا کام
کیا عشق نے آہ دشمن کا کام

فرق صرف یہ ہے کہ نظم 'جواں مرگ' میں عشق کا کوئی شعلہ نہیں ہے۔ یہاں آگ میں جلنے والی بای ذنب قتلتنی بھی نہیں کہتی، صرف خام سوزیم و نارسیدہ تمام کی نوحہ خواں ہے۔ اور جس طرح ڈرامے کا کردار اور ڈرامے کا ناظر کبھی کبھی متحد اور یکجان ہو جاتے ہیں، اسی طرح لڑکی کا نوحہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے لیتا ہے اور ہم غالب کے ہم زباں ہو کر کہتے ہیں ع

میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

آصف رضا ہمارے شعرا کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو مدت مدید سے مغرب میں مقیم ہے۔ ان شعرا میں ایک ہی دو ایسے ہیں جو خود کو مغرب میں سیاح یا مسافر کی طرح نہیں پیش کرتے، اور نہ ہی انھیں خود کو مغرب میں اجنبی کی طرح مقیم، یا دوطن سے شرابور تارک وطن یا مہجر کی طرح پیش کرنا پسند ہے۔ وہ ہماری شعریات میں رائج استعاروں (اور ان استعاروں کے پوشیدہ طرز احساس) سے کوسوں دور ہیں۔ ساقی فاروقی کی طرح وہ ایسے مشرقی ہیں جو مغرب کی فکر اور دنیاے شعر میں رچ بس گئے ہیں لیکن وہ ذہنی طور پر مغرب کے شہری بھی نہیں ہیں۔ ان کی آواز ہماری آواز سے مختلف ہے لیکن ملتی جلتی بھی ہے، اسے کسی مغربی کی آواز نہیں کہہ سکتے۔ وہ اردو کے شاعر ہیں، ہمارے شاعر ہیں، لیکن ان کا اسلوب ہمارے یہاں کے کسی نمونے کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ان کا بہت بڑا کمال ہے۔

'امریکہ' عنوان کی چند مختصر نظموں میں امریکی تہذیب اور معاشرت کی تنقید ملتی ہے، بلکہ ایک طرح کی نفرت ان نظموں کی تہ میں کہیں ہے۔ لیکن 'اجنبی' عنوان کی نسبۃً طویل نظم میں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انسانوں کا درد ایک ہی طرح کا ہوتا ہے اور انسان اپنا دکھ بانٹنے کو بھی دکھ بھوگنے کی طرح طرز وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ متکلم کے گھر سے پانچ سات گھر آگے رہنے والا شخص وہاں کی تہذیب کے اعتبار سے اجنبی ہی ہے، لیکن کسی داخلی ضرورت کی بنا پر وہ متکلم کی طرف ملاقات کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور اسے اپنی بیوی کی بیماری اور پھر موت کا حال سناتا ہے:

اب نہیں لگتا مجھے وہ اجنبی

میں سوچتا ہوں

شرق ہو چاہے کہ غرب

ایک ہے انساں کا کرب

لیکن وہ زندگی اور ہے، وہ دنیا اور ہے۔ کچھ دن بعد وہی پڑوسی تنہائی کی موت مرتا ہے، کسی کو اس کے جانے کی خبر نہیں ہوتی۔ متکلم جب دور کے سفر سے واپس آتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی لاش اس کے گھر میں کئی دن تنہا پڑی سڑتی رہی تھی۔ یہ خبر سن کر متکلم کو اپنا گھر اجنبی لگنے لگتا ہے۔

آصف رضا نے کئی بحریں استعمال کی ہیں اور وہ ہمیشہ کامیاب رہے ہیں، لیکن ان کے آہنگ میں کچھ کھردرے پن، یا روانی کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے کولرج کی بات یاد آتی ہے جو اس نے جان ڈن (John Donne) کی نظموں میں آہنگ کی ناہمواری کے دفاع میں کہی تھی، کہ Thinking poets سے یہ توقع کرنا ٹھیک نہ ہوگا کہ ان کا آہنگ عام، مقبول شاعروں کی طرح رواں اور سبک ہو۔ بات صحیح ہے لیکن روانی ہماری شعریات میں انتہائی اہم مقام رکھتی ہے۔ ہمارے شعرا، مثلاً راشد اور میرا جی اور اخترالایمان بھی Thinking poets ہونے کے باوجود آہنگ کی روانی اور سجل پن کے معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں، بلکہ اکثروں سے آگے ہی ہیں۔ آصف رضا کو اس پہلو پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے، ورنہ سوچ بچار، تعمق، وسعت نظر، احساس کی شدت، پیکر اور استعارے کا تنوع، کیا چیز ہے جو یہاں نہیں ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد

جون ۲۰۱۵

آئینے کے زندانی

شجر

قائل اسے کرتی ہے شب
افسردگی سے سر ہلاتا ہے
قدرآور اک شجر

دھند کا پردہ اٹھا کر جب دبیز
صبح کرتی ہے نمود
اس کو پاتی ہے کھڑا
آمادگی سے سرنگوں

عندیہ دیتی ہے جب تو
زورآور اس کی کارندہ ہوا
جھنجھوڑ کر اس کا
خشونت سے ہلاتی ہے تنا

سر دیئے اپنے پروں میں، خواب بیں
اپنی آنکھیں کھول کر، وحشت زدہ
اڑتے ہیں شاخوں سے طیور......
طفلگی کے اس کے ساتھی
اور رفیق وغمگسار
تب توڑتی ہے اس کے اعضائے بدن

شاخچے، شاخیں، ثمر
اور مٹھیوں سے پھینکتی ہے
اس کے پتے نوچ کر

اثبات جو کرتا تھا اس کی ذات کا
اب چھن چکا ہے اس سے وہ سایہ گھنا
اس کی بجائے وہ زمیں پر دیکھتا ہے
اک نقش جو ہے اجنبی
دھوپ میں برفاب سورج کی کھڑا
اک کانپتا ننگا تنا

اپنے رگ وریشے میں خوں
منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اسے
اور بھاری اپنی جڑ پر
اک کلہاڑا آہنی

خوف کے سرسبز جنگل میں
دلخراش اک چیخ ہوتی ہے بلند

ٹوٹا ہوا جنگل میں دیوانی ہوا کا شور ہے
گمبھیر خاموشی میں جس کی گونجتا
آراکشی کا شور ہے

مبارزت

تیرگی کے سامنے
کبھی سپر نہ ڈالنا
کٹھالیوں میں
سیاہ سورجوں سے صبح کا عرق
کرن کرن نچوڑ کر
اپنے مہر و ماہ ڈھالنا

حباب

ہے یہاں کسے ثبات
عدم کے بحر ہی کا اک حباب ہے
یہ حیات...
کائنات

شام

وسوسوں کی چلچلاتی دھوپ میں
دوڑتے جاؤ
تمھاری منتظر
سرخ سنگی حوض پر
بیٹھی ہے شام

بحر

آشوبِ تنہائی کا ہے یہ بحر اس میں
کس کو کس کا ہوش ہے
ہر موج اپنے آپ میں گم
اور ساحل کوش ہے

سفر

ہم کہ تازہ واردان زندگی
سراب رخ افق کی تابشوں میں جب نہائے تو
حریف گرد تہ بہ تہ ہمارے جسم و روح پر جمی
دل و نگاہ و درک کے
سب آئینے ہمارے گرد پوش ہو گئے
وہ گرد جو کہ دن بہ دن
یوں مہین سے مہین تر ہوئی ہمیں
کہ آئی نہ کبھی نگاہ میں
اسی کی تہ میں ہم
اپنے آفتاب و ماہتاب ڈھونڈتے رہے
ہماری زندگی تھی ایک سلسلہ
ظلمتوں سے اکتساب نور کا
تھیں ہماری چاہتیں، کراہتیں
صدق سے تہی صداقتیں

ایک دن
افق کی سان پر چڑھی
تیغ تیز دھار اک کرن کے وار کی
دل کو کاٹتی ہوئی گذر گئی

تو ہم پہ یہ کھلا
ہماری زندگی
طلسم پیچ وتاب تھی
دروغ کا
وہ دستگاہ اب نہ کام آئی کہ
تھی ہمیں خودی کے جو فروغ میں
خلا تھا جس میں جھولتے
انا کے تار عنکبوت سے
جو ہم گرے تو تھاہ نہ ملی ہمیں
اپنے ہست وبود کی
(تھی ہماری ذات ہی میں مختفی
ہمارے ہست کی نفی
وجود اور عدم بہم
ایک دوسرے میں ضم)

اس خلا میں روح نے جو سانس لی
تو اس کی یخ ہوا میں کپکپائے ہم
سراب حسن کار کے
مرقع بہشت سے بدر کھڑے ہوئے تھے ہم
شرمسار، ننگ اپنا ڈھانپتے
دشت میں جبلتوں کے کانپتے

تپا تپا کے دل کی بھٹیوں میں

خشت خشت

ہم نے جو اٹھائی تھیں عمارتیں
زلزلے سے ڈھے گئیں
غلط ہوئیں بشارتیں

رہبرانِ غیب کا کہیں پتہ نہ تھا
معجزہ فروش
اپنی کارساز حکمتوں کی گٹھڑیوں کا بوجھ پھینک کر
ہماری راہ سے فرار تھے
عدم کی وسعتوں میں چو طرف نظر کے سامنے
وجود کے مزار تھے

کتابِ دل کے ہر ورق سے مٹ گئے
ماورائی رنگ سب خیال کے
جمال کے
حکایتوں کے سورما
حکایتوں میں اپنی جا کے سو گئے
اور ہم
دروں کی اپنی ظلمتوں میں کھو گئے

غبارے

رنگیں غبارے
دیکھتا ہوں
ڈولتے ہیں جو خلا میں
اور سفر کرتے ہیں سوئے آسماں

اک غبارہ ہے مرا بھی
مائل افلاک لیکن ایک ڈوری سے بندھا
ہاتھ میں رکھتا ہوں میں جس کا سرا
محتاط کہ
مٹھی سے میری چھوٹ نہ جائے کہیں
اور زمیں سے
اس کا رشتہ ٹوٹ نہ جائے کہیں

آئینہ

ہجومِ عکس ہے ایسا کہ
کچھ دیکھا نہیں جاتا
مرا آئینہ
کچھ اپنی چمک ہی سے مکدر ہے

سینے کی حرات پا کے...

سینے کی حرارت پا کے پکے
انگوروں کا خوشہ
چٹکی سے پکڑ کر آنکھوں کے آگے
ننگی عورت لہراتی ہے

منہ بھینچ کے اپنے جھڑتے دانتوں کو
مبروص چھپاتا ہے

بے چہرہ
سنگین پہاڑی سے لڑھکا
مجحوب بدن

زیریں وادی میں
خون اگلتے پھولوں کے
پیلے پڑتے چہرے

اک سرد اور خشک ہوا کا جھونکا
تازہ کھودی مٹی کی بو
ہر سو پھیلاتا ہے

دریا

کس کی دریا برد کشتی سے ہے پیدا یہ بھنور؟
چھوڑا ہے کس نے
دستخط کی طرح سطح آب پر
اپنا نشاں...
ٹوٹے ہوئے مستول سے
لپٹا ہوا یہ بادباں؟

وہ کون کشتی بان تھا شوریدہ سر
یہ جاننے کے باوجود
کہ نہیں ہیں دوستدار
موج و ہوا
تقدیر اس کی ہو چکی ہے لوحِ اسود پر رقم
(دیکھتا تھا دیدۂ انجام بیں
سر خیز اک موج ہلاکت آفریں)
اس نے کیا قصدِ سفر؟

گردن اٹھا کر اپنی اک شہ زور موج
ہاتھ سے اپنے مٹاتی ہے نشاں

ٹوٹے ہوئے مستول سے
چمٹا ہوا اک بادباں

بے داغ سطحِ آب زار
بڑھتا ہے آگے کی طرف
دریا، ابد کا ہم جوار

موت

(رلکے سے ماخوذ)

غیر ہستی موت ہے؟
یا زاویے سے دید کے
ہے اسی کا نیم چہرہ
جو نگاہوں سے ہماری
ہے اندھیرے میں چھپا؟

ماں

مٹھی میں بھر کر
سوختہ سورج کی راکھ
شب اڑاتی ہے
ستاروں کی طرف

باولی

اُترا ہوا منڈیر پر
رنگیں لباس
تین سوزینوں سے لے جاتی ہوئی پانی تلک
اک باولی
طفلگی کی پُر تحیر نیلگوں
شفاف پیاس

لفظ

آئینے میں لفظ کے
منعکس تھے جو جہاں
حقیقتوں کا جن پہ تھا مجھے گماں
یہ کھلا کہ
وہ نگار و نقش تھے
خود مرے مرقع خیال کے!

گوسالہ پرست (۱)

دیکھو! قرائن سے ہے ظاہر
آچکا لمحہ نزول قہر کا
چشمے زمیں کی تہ میں واپس ہو گئے
مشتعل بھیڑیں سیاہ و سرخ چشم
چر چکی ہیں سب ہماری کھیتیاں
اب آب و دانہ کی یہاں
ختم ہے اپنی میعاد
جنباں ہے پیروں کے تلے
راضی نہیں ہم سے زمیں
ڈالے ہوئے دیکھو ہے کیسے تیوریاں
ماتھے پہ اپنے آسماں

دانے ہمارے منہ پہ یہ نکلے ہوئے طاعون کے
اعلان کرتے ہیں کہ ہم اک امت ملعون ہیں
حبرون (۲) کے ٹیلوں پہ دیکھو
وہ کھڑا افراز سے
تف بھیجتا ہے ہم پہ چرواہا نبی

---

(۱) بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کی سزا خدائے تعالی نے یہ مقرر کی کہ وہ تلواروں سے ایک دوسرے کو قتل کر دیں (قصص القرآن)۔
۲۔Hebron

گو ساقط الحرکت ہوئیں امواجِ صوت
برجِ صحرا پر کھڑی
ہاتھ کانوں پر دھرے
دیکھو اذاں دیتی ہے موت!
بریت ہرگز نہیں ہے اب مشیئت سے ہمیں
اٹھو! زمیں سے یہ ہمارا وقت ہے اخراج کا

گنبدوں میں جو دماغوں کے ہمارے گونجتی ہے
اک صدائے رعب دار
اور ہمیں اپنے تجاوز کی سناتی ہے سزا
آؤ اسے پورا کریں

آؤ چلیں
ہو کے تلواروں سے لیس
قائم کریں اپنی صفیں
گھپ اندھیری رات کے میدان میں
باندھے ہوئے سر سے کفن
اور نعرہ مار کر
اک دوسرے کا سر کریں تن سے جدا
راضی ہوتا کہ ہم سے برگشتہ خدا

آنکھیں

انساں کی آنکھوں کا ہے اور کام بھی کیا؟
ہستی کی بے پایاں وسعت سے ڈرنا
اور حد بندی اس کی کرنا

جہاز

دشمن کی ناکہ بندی سے
بچ نکلا ایک جہاز
ضبط اپنے سینے میں کر وہ بھاپ اپنی
اک اونچی سیٹی کی صورت میں
خارج کرتا ہے

نیلی وردی والا اس کا کپتان
مستول پہ مردہ ہے

ایک دخانی پیکر دھارے روح مگر
بے چین اس کی
تسخیر کا نقشہ اپنے آگے پھیلا کر
چرخ گھماتی ہے

تاروں کے گرداب میں چکراتا
اونچی سیٹی مار کے ڈوبتا ہے
اس کا آہن پوش جہاز

خوشی

(شوپنہار سے ماخوذ)

ہے خوشی
وہ وعدۂ فردا جسے
پورا نہیں کرتی کبھی یہ زندگی

کراچی

بچھرے ہوئے دریا کا ساحل
موجوں کی باچھوں میں ہے کف
بعد زماں سے عود کرتی ہیں
اسلاف کی پرچھائیاں
جھانک کر جو پردۂ تاریخ سے
کشتیوں کے اپنی خاک
اپنے پتواروں سے واپس پھیرتی ہیں

اک کشور تاریک کہ سورج جہاں
گہنا کے ہوتا ہے طلوع
اور جس میں بیچاں ہیں اندھیرے چار سو

نصب ہے مینار پر اخضر نشاں
خنجر نما محراب میں احمر ستارہ سرنگوں
چمکا ہوا ہے تین تلواروں پہ خوں

ظلمت کا پردہ جب اٹھاتی ہے
دکھاتی ہے سحر

غلطیدہ خاک وخوں میں سر
شام وسحر عیدالبقر

ہے زرد دہشت سے قبیلہ آل ابراہیم کا
دیکھ کر بغدوں کو اپنے چومتے
اولیا شیطان کے
نطفۂ آتش سے پیدا سبز پوش
خود پہنے آہنی
خلقت ہے سڑکوں پر دواں

رقصاں کبھی فوارۂ مغضوب
قعر میں پاتال کے اب خوف سے روپوش ہے
بربط گسستہ تار ہے اور بے کفن ہے
چور ہے پر مطرب آبی کی لاش

ہجرت کناں
اونٹوں کا سڑکوں پر دواں اک کارواں
کوہان ان کے خونچکاں
منعکس آنکھوں میں ان کی ایک گم گشتہ جہاں
ان کا مزاحم ہے مگر بحر عرب

تلخ پا کر اپنا ثمرہ زرد بصرہ کی کھجوریں
بال کھولے

تا بہ فلک گریہ اٹھاتی ہیں

شعلۂ آتش نمایاں طور پر؟
قہر آگیں صاعقہ
گر کر پہاڑی کاٹتی ہے
اور موت گھٹنوں پر جھکی
بہتا شگاف کوہ سے آب طہور احمریں
لپ لپ زباں سے چاٹتی ہے

سبز پتوں سے تقاطر خون کا
سدرہ پر لینے کو پناہ
طائرِ امید ہے جس سے فرار
اس شاخ زیتوں کا سرا خالی لچکتا ہے

جدھر میں جا رہا ہوں

جدھر میں جا رہا ہوں
اس طرف تیرا بھی گھر ہے
مری ہستی علامت کا سفر ہے

وصل

سرخ لاوے کا سمندر ساختہ
اک جزیرہ تھا وہ نادر یافتہ
جس کے بیچوں بیچ تھی آتش نفس
سرخ اک کھلتی دراڑ
وہ جس کے پار
کرتی تھی میرا انتظار

اس کے سر پر تھا درخشاں ہالۂ مریم کا نور
وہ کھڑی تھی خود سپردہ پُر شکست و پُر غرور
حور پیکر باکرہ میری سیاہ
اس کی آنکھوں میں تھی ترغیب گناہ

میں نے پہچانا اسے اور اس نے پہچانا مجھے
بیقرارانہ بڑھے اور لگ گئے دونوں گلے
گر رہی تھی عرش سے پیہم ہمارے سر پہ گرد
ہو رہا تھا آسمانوں سے فرشتوں کا نزول

ناچ

ٹوٹتی اپنی رگوں کا شور ہی وہ زمزمہ ہے
جس کو سن کر چونکتی ہے سر بزانو روح تو
غم کے افق پر دیکھتی ہے
صبح اک ہوتی طلوع

مرطوب سورج کے تلے
چھیڑتا ہے زمزمہ اپنا حزیں
مطربوں کا طائفہ
جس کی گت پر ناچتی ہے
ماتمی ملبوس پہنے زندگی

جھیل

کالی چٹانوں پر کھڑے دیتے ہیں پہرہ
دیو قامت دیودار
روپوش رکھتا ہے اسے سورج کی نظروں سے
حصار کوہسار

کروٹیں لیتا ہوا سینے پہ اس کے صبح و شام
کہر ادبیز
کرتا ہے اس پر آشکار
افراز شب کا درخشاں
اونچے صنوبر اس کے بازو ہیں دراز
سمت فلک
ان کی رسائی سے مگر ہے دور رخشاں ماہتاب
بند کرتا ہے کھلا اپنا شگاف
کہر ادبیز

وہ قید اک زندانِ تیرہ میں مگر
اس کی متاع
ایک پل کو آئینے میں اپنے باطن کے
قمر کا انعکاس

ناگفتہ

بینا آنکھیں دنیا جھانکیں
لب جنبش میں لائیں
ان کے پیچھے
دونا بینا آنکھیں
باطن کے گھور اندھیرے میں جو
اپنی پلکیں جھپکائیں
ہونٹ ہلانا جب چاہیں
تو ان کو مجبور پائیں

آب خاموشی سے ابھری
الفاظ کی کشتی
سنگین چٹانوں سے ٹکراتی ہے
اور ریزہ ریزہ ہو کر
ناگفتہ کے بحرِ بے پایاں میں
گم ہو جاتی ہے

وہ چاند ستارے

وہ چاند ستارے

جو در آئے تھے مجھ میں

اب چاٹ کے ہیرے میرے لہو کے

میری رگوں میں مردہ ہیں

خروج

افلاک پر
ترتیب ہے بگڑی ہوئی اجرام کی

صلب سے جیسے
شگاف کوہ سے کرتی نمود
پھیلائے پر
تمثیلیں سیہ افکار کی

کوہ کی چوٹی
مثل سرِ پستان نوکیلی
زیرِ نگیں ڈھلوان پر
علاماتِ مقدس ہیں گڑی
جست کرتا غار سے کلب سیاہ

جنبش میں دلدل کا شکم
اوج پر گاڑے قدم
کیچڑ سے آلودہ
نعرہ لگاتا ہے بہیمہ

قامت کی اونچی کاہنہ

اپنی گہری نیند میں

دانتوں سے آنول نال اپنی کاٹتی ہے

اور کوکھ سے کالا ولد آزاد کر کے

تیرہ منطقے پر چھوڑتی ہے

منسوخ ہے فردا کا سورج

گونجتا

قطبین کے مابین ہے

اہرمن کا قہقہہ

قصر

دبے پاؤں کرن شعلہ
فلیتے کو دکھاتی ہے
سحر پھر قصرِ شب میرا
دھماکے سے اڑاتی ہے

عابدین

وہ حکایت کون ہے، جس کو
برف کے قرطاسِ ابیض پہ کرتے ہیں رقم
ان کے حریفانہ قدم؟

عابد، بجاتے چٹکیوں میں گھنٹیاں
نیستی کے صلب میں پا کر وجود
ہیں گامزن سوئے فنا
حرکت میں رکھتی ہے انھیں
آرزو افراز کی

تجسیم ہیں کس خواب کی بے اصل ان کی ہستیاں؟
نا گفتہ و نا گفتنی
سر نہاں

چوٹی کی ہیبتناک موسیقی

آمدِ طوفان کے آثار ہیں

اک ہیولی برف کے کوہان پر اسوار ہے

تھامے مہار

دیوتاؤں کا نگر

لیکن نہیں ان کو خبر کہ اپنے جبڑے کھول کر

ہے منتظر ان کو نگلنے کے لئے قعرِ سیاہ

گھونگھا

یاد آتی ہے اس کو خواب نما
اپنی جنت گم گشتہ
وہ جس سے بدر ہے اپنی کمر پہ لادے اپنا گھر
ہے اس کو لق و دق صحرا کا درپیش سفر

ریت کا ٹیلا یاد دلاتا ہے اس کو
اک ساحل اور اک سرخ چٹان
جھانک کے جس کے روزن سے وہ دیکھتا تھا
آغوش مادر سے جیسے
دنیائے ازرق اپنی حسیں

نوچ کے کس دشمن کے آبی ہاتھوں نے
اس کو جلتے صحرا میں پٹکا؟
معلوم نہیں

حدِّ نظر تک پھیلی ریت کے تپتے سینے پر
اندام گھسیٹے وہ اپنا' چڑکا
رینگ رینگ کے بڑھتا جاتا ہے آگے

آنکھوں میں اس کی گھومتا ہے
اک ازرق بحر کا خوش منظر
آفاق کے پار سے وہ جس کی
موجوں کا بلاوا
دوشِ ہوا پر آتا سنتا ہے

صحرا کے افق پر ایک سحابِ خشک گرجتا ہے
اور بوسیدہ ڈھانچوں پہ کھڑی
صحرا کی ہوا اپنا کوڑا لچکاتی ہے

چیخ

بہتا ہے ترے کانوں سے لہو
کس چیخ کو سن کر جنگل کی گہرائی سے
لوٹا ہے تو؟

اک سیاہ مستی ہے

میکدہ نہ مطرب ہے
جام ہے نہ ساقی ہے
کھیلتی شرابوں سے
اک سیاہ مستی ہے

زمستاں

پھاند کر خطِ افق گم ہو گئی
ہرنوں کی ڈار
ہجرت میں ہے
کالے پرندوں کی قطار

امریکہ

بہشت

خنزیر سورج تھوتھنی اپنی دھرے
نگراں ہے افلاک سے
کوچۂ دیوار کا کہ جس میں ہے(۱)
دائرہ دنیا کا سینگوں پر اٹھائے
اک دیو قامت بیل سنگین و سیاہ
(ہے شورِ برجِ ثور تک جس کا رسا)(۲)

سینگوں سے پیچاں اس کے ہے مارِ سیاہ
جو اپنی لہراتا ہے دوشاخہ زباں...
اور سونگھ کر بدمست ہے
بوئے گناہ

عصیاں کی اس تعمیر کے
رنگِ خوں ہیں سنگ و خشت
شدّادکی ہے یہ بہشت

---

(۱) وال اسٹریٹ Wall Street (۲) بیل کی شکل کا ایک برجِ آسمانی۔

لوح پر محراب استقبال کی
تحریر یہ الفاظ میں
"ہے آگ افضل خاک سے" (۳)
زیبا جو ہے وہ ہے کریہہ، نیکی بدی

ایک اونچے طاق سے
ٹوٹتی ہے گر کے آدم کی شبیہ

---

(۳) شیطان کا دعویٰ جس کی بنیاد پر اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا (قصص القرآن)۔

امریکہ

رات

قمقموں سے جگمگاتے آسماں کے بام و در
شب کی قحبہ
بادۂ شہوت سے مست
ستر کھولے بالکونی میں کھڑی

پستان کو اپنے دبوچے ہاتھ میں
پچکاریوں سے پھینکتی ہے چو طرف
شیر سیاہ

امریکہ

گرجے میں

گرجے میں
ننگی ہو کر
کوکین کی رانی ناچتی ہے (۱)

اپنی چٹکی منہ میں رکھ کر
پادری سیٹی مارتا ہے

Cocaine(۱)

امریکہ

اجنبی

(۱)

ساتواں اس کا مکاں، تنہا تھا وہ جس کا مکیں
میں دیکھتا ہوں دور سے
وہ کاٹتا ہے حاشیہ
رعشہ زدہ ہاتھوں سے اپنی زرد پڑتی باڑ کا
چرم پوش اک استخواں
کہ دیکھ کر جس کو تصور ذہن میں
ہوتا ہے پیدا موت کا

پکڑے ہوئے ہاتھوں میں وہ اک زنگ خوردہ آب پاش
جس سے اک کمزور سی پانی کی دھار
گرتی ہے پھلواری میں، جس میں ہے کھڑی
اک بانجھ پودوں کی قطار
(میں سوچتا ہوں کہ کبھی
گل خیز تھی اک روز پھلواری یہی؟)

عطر بیزی سے معطر زیب تن اس کے
قمیص اک پھول دار
میں سوچتا ہوں کہ نہیں بھولا ابھی تک

اپنے ماضی کی بہار
رنگ و بو سے آج بھی ہے اس کا رشتہ استوار

صحبت انسان سے محروم شاید
وہ دیکھ کر میری توجہ منعطف
ٹوک دیتا ہے مجھے
اور بڑھا دیتا ہے میری سمت
زندگی کے لمس سے محروم اپنا سرد ہاتھ
مس سے جس کے جھنجھنا جاتی ہیں میری انگلیاں
(عطر پاشیدہ ہے گو اس کا لباس
کافور کی آتی ہے مجھ کو اس سے باس)

اس کو کہتے ہیں فلاں
اور مجھ کو کیا؟
ہم کہ ہیں دو اجنبی
برف اس کی توڑنے کی اک سعی (۱)
تا آنکہ وہ دعوت مجھے دیتا کھڑا ہے
کھول کر اپنے مکاں کا پیش در

دہلیز جب کرتا ہوں اس کی پار تو
ابخرے خوشبو کے استقبال کرتے ہیں مرا
محسوس ہوتا ہے مجھے

---

(۱) انگریزی محاورہ To break the ice = تکلف اور سومیات کی بنا پر اختیار کی ہوئی خاموشی کو توڑنا۔

کہ جیسے داخل ہو رہا ہوں میں کسی درگاہ میں
اور وہ مجاور ہے دکھاتا ہے مجھے جو راستہ
نیم روشن عکس سے کرنوں کی ہے اک پیش اطاق
غرقِ سکوت

میں چاہتا ہوں اس سے پوچھوں
ساتھ اس کے کیوں نہیں اہل و عیال
پر بدل دیتا ہوں میں اپنا خیال
مغرب کا وہ
مشرق کا میں
شاید عجب اس کو لگے میرا سوال

زیبندہ دیوار ہے اک پیکر حسن و جمال
قید جس کو چوکھٹے کی
کر رہی ہے لازوال

وہ تعاقب کر کے نظروں کا مری
کہتا ہے بھر کر سرد آہ
''میری بیوی...
تھی وہ میری کائنات۔''

(۲)

''آہ وہ مہلک بخار!

آگ کر دیتی ہے لوہے کو گداز

وہ تو گڑیا تھی فقط اک موم کی

پگھلا ہوا قالب زمیں پر چھوڑ کر

تاریک حصے میں قمر کے جا بسی

آج تک بھولا نہیں میں آہ، وہ یوم سیاہ

وہ رات جب

سب کچھ بہا کر کے لے گیا تھا

وقت کا سیلِ رواں

میرے سوا۔''

اس کا حزیں لہجہ ہے خود الزامیہ

اپنے بچ رہنے پہ جیسے ہو اسے شرمندگی

سنتا ہوں استعجاب سے...

میں، سمندر پار کا نووارد اک اجنبی

کھولنے کیوں مجھ پہ آمادہ ہے وہ

ذات کی اپنی تہیں؟

پھر سوچتا ہوں

صحبت انسان سے محروم شاید...

ہے چوکھٹے کے بالمقابل کنج اک آراستہ
حزنیہ لہجے میں وہ کہتا ہے مجھ سے
''تھا اسے پھولوں سے پیار۔''
(یاد آجاتی ہے مجھ کو بانجھ پودوں کی قطار)

اوپر تلے آراستہ گملوں میں پودے پھولدار
کاغذی گرچہ تمام
میں سوچتا ہوں
عین شایاں اس کے ہے
یہ گلستانِ بےخزاں

اب نہیں لگتا مجھے وہ اجنبی
میں سوچتا ہوں
شرق ہو چاہے کہ غرب
ایک ہے انسان کا کرب

(۳)

جب سمندر پار کا کر کے سفر
میں لوٹتا ہوں اپنے گھر
تو دیکھتا ہوں
ساتواں اس کا مکاں
چوپٹ کھلی ہیں اس کی ساری کھڑکیاں

"سڑ چکی تھی اس کی لاش
بد بو سے پھٹتا تھا دماغ"
اس کا ہمسایہ بتاتا ہے مجھے
(یاد آتا ہے مجھے اس کا معطر پیش طاق
اور عطر پاشیدہ لباس)

وہ مکینِ لامکاں، اب لازماں
چشمِ تصور میں اسے میں دیکھتا ہوں
شاہراہ نجمیہ پر گامزن
(سوئے قمر؟
ہے اندھیرے میں ابد کے کوئی اس کا منتظر؟)

اس کے مکاں سے لوٹ کر
آتا ہوں میں
تو ایک لمحے کے لئے
اجنبی لگتا ہے مجھ کو اپنا گھر

شہد

برگِ گل پر تھی گرچہ شبنم ہی
چاند کا شہد جان کر میں نے
اس کو نوکِ زباں سے چاٹ لیا

تحفہ

نارنگی کا یہ چھلکا
کھول نزاکت سے اس کو آہستہ
کہ اس میں چھپا کر بھیجا ہے سورج نے تجھے
اپنی سنہری قاشوں کا تحفہ

کیا فرق پڑتا ہے؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
مگدر گھما کر پہلواں
ٹھونکتا ہے اپنے خم
یا مجھ کو تجھ سے عشق ہے؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
تجھ کو حاصل ہے طبائع کا قبول
قطبی ہرن کا پیٹ یا
لومڑی کے پیٹ جیسا نرم ہے؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
گذران اپنی زندگی کا ہے وجود غیر میں
یا جائفل کے بیج کا پردہ ہے سرخ؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
دسترس سے عقل کی
سر حقیقت دور ہے،
یا ادا کرتا نہیں محصول اپنا رنگریز؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
معجزے موئے قلم سے کوئی کرتا ہے رقم
یا روش پر سرخ بجری ہے کٹی؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
فہم ناممکن ہے اپنی ذات کا
یا چھوڑ کر دیوار کو
کھمبے پہ چڑھتی ہے چڑی پنجے کی بیل؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
وجدان ہی کی صورتیں ہیں
یہ زماں
اور یہ مکاں
یا مسلح توپ سے ہے چار مستولی جہاز؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
اس جہانِ خارجی کی ہے حقیقت داخلی
یا چقندر اور کدو کا تجھے بھاتا ہے ساگ؟

کیا فرق پڑتا ہے اگر
محدود اور ناقص ہیں انساں کے حواس
قطر یا بھوری پہاڑی کا ہے پورے آٹھ میل؟

یا پیٹھ پہ ہاتھی کے ہیں
تھیلے بندھے بارود کے؟
یا مرے بازو پہ ہے گودا ہوا
سرمے کا پھول؟

کیا فرق پڑتا ہے؟

کلی

اطلس کے بستر پر کھلی
ناف گلابی کی کلی
صبح تک مہکی رہی ساری گلی

اکتوبر

مائل بہ زردی باغ ہے وہ
ہم جس میں ملا کرتے تھے
پودے تھے جو سبز کبھی
اپنا پوشیدہ رنگ نمایاں کرتے ہیں

سورج نے اپنا زاویہ بدلا ہے
ترچھی پڑتی ہیں اس کی کرنیں
تو مجھ سے بچاتی ہے نظریں
اور میں تجھ سے
توڑتا ہم دونوں کی سرگوشی
پتوں کا شور حزیں

پنہاں تھی کہاں ہم میں یہ تھکن
اور سناٹا...
جو آج ہمارے باطن میں در آیا ہے؟

کیا ہم نے یہ سوچا تھا کبھی کہ
دزدیدہ قدموں سے اک دن

یوں اکتوبر آئے گا

اور جو تھے محبوب ہمیں

وہ رنگ چرا لے جائے گا؟

کاذب

وعدہ کرتی، خواب دکھاتی صبح کی سرگوشی سن کر
جب کھولتی ہے آنکھ اپنی کلی
تو دیکھتی ہے
مرجھاتے پھولوں کا منظر
احساس اسے تب ہوتا ہے
کاذب تھی سحر

کارزار

''مادر کے شکم میں نورِ الٰہی سے روشن
تخمِ آدم
شیطان مگر اس میں اپنی
ظلمت آمیزش کرتا ہے

جانتے ہو
بچّہ پیدا ہو کر کیوں روتا ہے؟
علم اسے یہ ہوتا ہے کہ ذات اس کی
جنگ کا اک میدان ہے، جس میں
صف آرا ہیں دو دشمن،
وہ اپنے اندر ہونے والی جنگ سے ڈر کر روتا ہے۔''

قاتل

تاروں سے بھرا وہ ایک فلک
جس کا تنفس زہریلا
میری سانسوں میں شامل ہے
وہ قاتل ہے

گرداں اپنے محور پر وہ
اک تاریک اکبر تارا
اور میں اصغر بیچارہ
گرداس کے گھومتا بے بس سیارہ
اس کی کشش مقناطیسی کرتی ہے مجھے پارہ پارہ
وہ اپنے عدم میں میری ہستی ضم کرنے پر مائل ہے
وہ قاتل ہے

آغوش اس کی جیسے گردش میں ایک بھنور
جو کہ جہازوں کو چکراتا ہے
اور تیرہ اپنے گہرائی میں لے جا کر
مستور چٹانوں سے ان کو ٹکراتا ہے
ہر چند کہ وہ میرے بھٹکے خوابوں کا ساحل ہے
وہ قاتل ہے!

دوزخ کا طبلچی

دوزخ کا طبلچی
آنکھیں مونڈے
قعرِ روشن سے اٹھتا
راگ بھڑکتی چیخوں کا سنتا ہے
اور جوش سے طبلہ پیٹ کے اپنا
وجد میں سر دھنتا ہے

دارا شکوہ

(۱)

خوشبودار دھوئیں والا
اپنا مرصع نے کا حقہ پی
اپنے پیر کے پیر دبا
یا اس کی تھوکی لونگ چبا لیکن (۱)
مت خونیں شطرنج بچھا
یہ بازی تیرے بس کی نہیں
ناداں! ہر جائے گا!

نازونعم کے پروردہ
تجھ کو یہ بھروسا ہے کہ بلند اقبال ہے تو؟ (۲)
سوچ ترا ہے کون عدو
مت لشکر آرا ہو سرباز!
تو ایک کبوتر ہے اور وہ شہباز

خانہ بخانہ، نادیدہ
تقدیر اٹھا کر چٹکی سے اپنے مہرے
میداں میں بڑھاتی ہے

(۲)

ہتھیاروں کی مہلک جھنکار سے
مرقد پر سبز چڑھی چادر کی رنگت کا
تیرہ باطن جنگل
چو اطراف سے گونجا تھا

چیخوں کے افق پر سناٹا چھایا ہے
جھنڈے کو جھکائے خون آلودہ شام کھڑی
اپنے شکستہ جسموں پر روحیں گریاں

(۳)

ریگستان کے ٹیلے پر
زرد لبادہ آندھی کا لہراتا ہے
اس کا للکارا صحرا کو پھیلاتا ہے
شیشے جیسے ریت کے ذروں میں
دشمن کی آنکھ چمکتی ہے

(۴)

ٹیلے کی آڑ میں
ایک طرف رکھ کر لوہے کا پنجہ
اکڑوں بیٹھا
قاتل کرتا ہے استنجا

(۵)

اٹھتا ہے چھتوں، کوٹھوں، چوباروں سے
شورِ آہ و بکا اور شورِ دعا
تحلیل فضا میں جو ہوتا ہے
جیسے دھواں

(''تیری کرامت نے ہی اسے نابود سے ہست کیا
اب تو ہی بچا اس کو خواجہ۔'' (۳)
''وہ تیرا بھگت ہے
مہا گیانی اور ودوان
اس کی رکشا کر بھگوان!'')

ہار کے بازی اوندھا ہے اس کا اقبال
دشمن کا سورج اوج پہ ہے، نیزہ بردار
قیدی پر ہے شیشے جیسی اس کی آنکھ جمی
جس کے سر پر چترِ شہی کی چھاؤں نہیں
بے ہودہ اک ہاتھی پر اسوار
ڈول کے جو چلتا ہے جیسے اس کے شایاں
قلعہ دار

خاموشی سے اس کے پیچھے چلتے ہیں
غزنی کے مشائخ اس کے ماتم دار

اوراپنے لباسِ عریانی میں
نیمہ کلمہ پڑھتا سرمد کاشانی (۴)
اور لئے ''سرا کبر''
سر کو جھکائے
ژولیدہ مو، شوپنہار (۵)

(۶)

''کیوں تلواروں پر دھار چڑھاتے ہو؟
تم کس سے لڑنے جاتے ہو؟''
وہ اپنی قدیمی تلواریں اونچی کر کے ٹکراتے ہیں:
''ہم بھائی سے بھائی کے خون کا رشتہ پکّا کرنے جاتے ہیں۔''

جھاڑی سے اچھلتا
زردوزی کے پٹّے والا
تیرزدہ کالا چیتا
تختِ طاؤس کے زریں اِستادوں سے اڑتا ہے
تیغ کے موروں کا جوڑا

تنجیم کے ماہر!
چھوڑ رسوئی بھاگ! (۶)
حرکت پہ نظر کرتاروں کی
داخل ہے بارہویں گھر میں زحل (۷)
جاگی ہے آنکھیں مل کے اجل

یہ ساعت ہے تلواروں کی
چار طرف سے واروں کی

کمرہ ہے منور اس کی روشن چیخوں سے
گلزار کھلا ہے اس کی قبائے ابیض پر
سرخ گلابوں کا
شانوں پر اس کی زلفیں چھوٹی ہیں
وہ موت کے غش میں
جھومتا ہے مجذوبانہ

وسط میں باغ شاہی کے
طاؤس نما جھنکار رہا ہے
خون کا فوارہ
دو نیم پڑا ہے صوف کا اکتارا

چھوڑ کے پیچھے اس کا تن
خون اس کا رواں
دہلیز پہ آ کر رکتا ہے...
زنداں میں سرخ آئینے کے
دارا کا مقید عکس پھڑکتا ہے

سورج کی زرتار کرن میں
خون کے موتی صبح پروتی ہے

جمنا کے آب سرخ کی تہ میں سیمیں ماہی کا سایہ
لہرا کے گذر جاتا ہے
وہ جس کی سیپ کا موتی ہے
زندانِ عدم کی دیواروں سے
سر ٹکرا کر روتی ہے

(۷)

جو چمکا تھا آنکھیں اس کی خیرہ کرتا
کیا تھا نورِ خدا؟
یا تھی فقط تیغ براں؟
تھال میں کیا زریں سرپوش تلے
اس کا سیاہی مائل تھا چہرہ؟
(کیا کلمہ تھا ناگفتہ
اس کے لبوں پر خوں بستہ؟)
فانوسِ گردِ خاک میں یا اپنے سر سے کٹ کر
روشن تھا صوفی کا سر؟

(۸)

وہ ایک منور منظر تھا
موت کی پرچھائیں سے جو تاریک ہوا
اپنے تیرہ منبع سے نزدیک ہوا

زیرِ زمیں
قفلِ ابجد جیسے حرفوں کی چابی سے
یوں کھلتا ہے اس کا سینہ
دہشت جو نہفتہ تھی اس میں
مٹی کے پردے کو ہٹا کر ظاہر ہوتی ہے
اپنے محاسوں کو لہراتا اک کیڑا (۸)
جو روئے زمیں پر
فتح کا اپنی کرتا ہے اعلان

وہ نادیدہ قوت کہ جو
موت کے مس سے جاگی ہے
اب ہے اس کے متروک بدن کی صورت گر
اب اور ہی قالب میں ہوگا وہ جلوہ گر

وہ سرکنڈوں کے جھنڈ میں دیکھو
بے جوشن
ضعف سے کانپتے اس کے بازو ہیں!
اور اس کے دوش و سر سے جدا
ٹیلے کے گیاہِ سبز میں مل کر
صلح کا پرچم لہراتے
اس کے سفیدی مائل گیسو ہیں!

(۹)

صلح کل کے ایدیشک کی دورنگی
اک ہاتھ میں صوف کا اکتارا
دوسرے میں تلوار مگر ننگی
(وہ زیرِ زمیں بھی شاید ایک نہیں
دو ہیں اس کے مدفن
ایک میں سر
اور دوسرے میں ہے اسکا تن)

(۱۰)

ہو کر بھائی کے ہاتھوں سے کشتہ
صوفی ہے تجھے شکوہ کیسا؟
کیا بھول چکا تو
آدم سے اپنا خونی رشتہ؟

کر دشمن کا شکر ادا
کہ تیغ سے جس کی تیرا مایا جال کٹا
(وار پڑا ایسا بھاری
پاتال سدھارا راج ادھیکاری)

کیا تیرا طریقہ موت نے چمکایا ہے؟
براق فرس تاروں سے اتر کر
تجھ کو لینے آیا ہے؟

ناسوت کا عالم چھوڑ کے تب سالک
ملکوت کو جا
اور آکاش پہ
وحدانی سورج کے پرکاش کی
ایک کرن بن جا

(۱۱)

ایک شکستہ مرقد پر
اونچا جیسے فتح کا پرچم لہراتا
اک سرسبز شجر

چھاتی میں زمیں کی پنجہ گاڑے
اس کی جڑیں
اور رس ریشے شریان نما

ہیں زیریں تاریکی میں اس کی رواں
کالے پانی کی جھیلیں
اور آویزاں ہیں شاخوں کی محرابوں میں
پھول کہ جو روشن ہیں
جیسے قندیلیں
دوشِ ہوا پر پھیلتی ہے ان سے اٹھ کر ہر سو
اک سڑتے لاشے کی بُو

حواشی

۱۔ دارا کے پیر و مرشد۔

۲۔ اپنی سالگرہ کے موقع پر شاہ جہاں نے اپنے چہیتے دارا کو "شاہِ بلند اقبال" کا خطاب عطا کیا تھا۔

۳۔ بیٹیوں کی متواتر پیدائش سے دل برداشتہ شاہجہاں نے خواجہ معین الدین اجمیری کی درگاہ پر حاضر ہو کر اولادِ نرینہ کے لئے نذر و نیاز گزرانی جس کے کچھ ہی عرصے بعد بمقام اجمیر دارا کی ولادت ہوئی۔ ("رودِ کوثر: اسلامی ہندو پاکستان کی مذہبی اور روحانی تاریخ" مصنفہ محمد شیخ اکرام، ایم۔اے۔)

۴۔ ایک جید عالم اور مجذوب جو شاعر بھی تھا اور دارا جس کا مرید تھا۔ اسے بحکم اورنگ زیب قتل کیا گیا۔ اس پر دو جرم عائد تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ ستر پوشی سے انکار کر کے مادرزاد برہنہ پھرا کرتا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ صرف آدھا کلمہ پڑھا کرتا تھا یعنی "لا الہٰ"۔ اس کے جواز میں وہ یہ دلیل لاتا کہ وہ ابھی نفی کے درجے میں ہے، جب اثبات کے درجے پر پہنچے گا تب پورا کلمہ پڑھے گا۔ جب اس کا سر تن سے جدا کیا جانے لگا تو اس نے اور اشعار کے علاوہ یہ شعر پڑھا:

سر بریده از تنم یارے کہ بامایار بود

قصہ کوتہ گرد ورنہ دردِ سر بسیار بود

("داراشکوہ: احوال و افکار" مصنفہ محمد سلیم سے ماخوذ)

۵۔ "سرِ اکبر" دارا کا کیا ہوا اپنشدوں کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ ہے۔ اسی کا ترجمہ جرمنی میں لاطینی زبان میں کیا گیا۔ اس طرح یورپ کو اپنشدوں سے متعارف کرنے کا سہرا داراشکوہ کے سر جاتا ہے۔ اس کے لئے شوپنہار نے دارا کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ یہ کتاب تادمِ آخر شوپنہار کے سرہانے رہی۔ اسی کتاب کے بارے سے اس نے کہا تھا:

It has been the consolation of my life and will be the consolation of my death.

شوپنہار دارا کی موت کے ایک سو انتیس سال بعد پیدا ہوا، لہٰذا یہاں اس کا حوالہ "سہو زمانی" یعنی Anachronism کے ذیل میں آتا ہے (جسے شیکسپئر نے بارہا اپنے ڈراموں میں استعمال کیا ہے۔)

۶۔ فرانسوا بر نئے (Francois Bernier) نے اپنی مشہور تصنیف Travels in Moghul

Empire میں اور مولانا محمد حسین آزاد نے ''قصص الہند'' میں دارا کو بوقت قتل رسوئی میں مسور کی دال

پکاتے ہوئے دکھایا ہے۔

۷۔ ستارۂ زحل علم نجوم میں نحس گردانا جاتا ہے۔

۸۔ محاس یعنی Antenna یا Feeler جن کے ذریعے بعض کیڑے چیزوں کو چھوتے اور محسوس کرتے ہیں۔

کافور کی بو

سب مست ہیں جس جھونکے سے
سونگھ کے پھولوں کی خوشبو
کیوں آتی ہے اس سے مجھے
کافور کی بو؟

کیا کہا ہوا نے

کیا کہا ہوا نے اس کے کان میں
جس کو سن کے وہ
ہوا کے دوش پر بکھر گیا؟

''عبث ہے اس کی جستجو
نابلد ہیں اس سے چار سو
شبیہ تک نہیں کہیں
نہ تھی کبھی
وہ فقط ترے ہی دشتِ روح کا سراب تھا
نمود اس کی
خود ترے وجود ہی کا خواب تھا۔''

یہ کہا ہوا نے اس کے کان میں
کہ جس کو سن کے وہ
ہوا کے دوش پر بکھر گیا

فرار

پی کے شبنم کی شراب
لڑکھڑا کر رات گرتی
مری بانہوں میں آ

چاہتی ہے روح تیری بھی اگر ایسی خوشی
کہ جس میں زہرِ غم کی آمیزش نہ ہو
چل میرے ساتھ
بھول کر شام وسحر کا پیچ وتاب
دیکھ میرے ساتھ خواب
اس منطقے کا کہ جہاں
انسان پر عائد نہیں جبرِ زماں

لوٹنے کے واسطے تیری بہار
دیکھ! آتا ہے سرکتا تیری جانب ریگزار!
مت دیر کر
کشتی میں آ، ہو جا سوار
جو ہے ہماری منتظر
کھولے محیطِ نیلگوں میں اپنا زریں بادباں

اس سے پہلے کہ ہمیں کر دے جدا
موت کا دست سیاہ
دور کربِ آگہی سے نیلگوں آفاق پار
خود سے ہم آغوش جینے دے مجھے
تلخابِ ہستی بھول کر
اپنے لبوں سے انگبین انبساط
جی بھر کے پینے دے مجھے

آہ میری پسِ غروب کی جاں

آہ میری پس غروب کی جاں!
اپنی راتیں گذارتی ہے کہاں؟
تو بھٹکتی ہے آسمانوں پر
ڈھونڈتی راستہ پہاڑوں میں؟
کیا گذرتی ہے تجھ پہ جاڑوں میں؟

کرۂ زمہریر ہے کہ جہاں
تو مقید ہے
آسماں جس کا
ہے شموس و نجوم سے خالی
رات ہے، جس پہ جاوداں طاری

یا ملا ہے فلک پہ تجھ کو مکاں
جس کی چھت پر نقوش کندہ ہیں
چاند تاروں کے اور مداروں کے؟
جانتے ہیں نجوم نام ترا
نوعروسہ کا ہے مقام ترا...
مانگ بھرتی ہیں تیری تاروں سے
سات بہنیں (۱)... سہیلیاں تیری؟

کیا ضعیف قمر کی چومتی ہے
اٹھ کے ماتھا ترا محبت سے،

سرد
چرخے پہ کات کر دھاگا
شال زرتار تیری بنتی ہے؟

اپنا معمول تو بتا کہ کب
جادۂ شیر پر اترتی ہے؟ (۲)
کب ستاروں سے تو گذرتی ہے؟

اپنی آنکھوں میں بھر کے غم تیرا
شب کے پچھلے پہر سے تا بہ سحر
راستہ دیکھتے ہیں ہم تیرا

۱۔ عقد ثریا (مجموعۂ نجوم)　　۲۔ جادۂ شیر: کہکشاں (Milky way)

وار

تھا وہ کسی جلاد کا وار
کہ خون کا فوارہ اچھلا
تو دہشت سے تینوں مل کر چلائے
زخمی، زخم، اور زخم رساں تلوار

گماں

ہم کو گماں یہ ہوتا ہے
ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں جب کہ
ہم مستقبل کے ہاتھوں سے
پیچھے کو دھکیلے جاتے ہیں

تیری آواز

تیری آواز کے جھونکے سے
تیری یاد کے کجلائے
انگارے پھر دہکے

تازہ ہو کر
شاخ دل پر مرجھائے غنچے
پھر زخم نما مہکے

بے صوت پرندے
لے اپنی واپس پا کر
اک اونچی تان میں
پھر چہکے

مردہ دل دوبارہ دھڑکا
ٹیس لگی دل میں اٹھنے
پھر رہ رہ کے

نسبت

تنگ فضا خارج کی جتنی ہوتی ہے
روح کی پہنائی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے

نارسیس

(جارج ٹریکل Gerog Trakl سے ماخوذ)

قربِ فلک سے درخشاں
کہسار وہ
تاریک ہے
اس سے اب آتی نہیں کوئی صدا

اک منطقہ
بے نطق جس میں خود بدر
وہ پیٹ کے بل لیٹ کر
خود کو کرتا ہے تلاش
آئینے سے آبِ مردہ کے مگر
عکس ہے اس کا فرار

---

(۱) یونانی اساطیر کا ایک معروف کردار Narcissus جو پانی میں اپنا عکس دیکھ کر خود پر عاشق ہو جاتا ہے۔

رشتہ

جال اپنی زرد شعاعوں کا
پھینکا ہے خزاں کے سورج نے

سبز کبھی جو تھیں شاخیں
وہ جن پہ کھلا ہر پھول کبھی انگارا تھا
اب پتوں سے ننگی ہو کر
سرد ہوا میں کانپتی ہیں

لیکن دیکھو وہ نوکیلے
اب بھی شگفتہ ان پر کچھ کانٹے ہیں

ان پیڑوں سے اپنا رشتہ مت توڑو
یہ یاد رکھو
کہ ہم نے انھیں کے سائے میں
بیٹھ کے اپنے دکھ سکھ بانٹے ہیں

مقدس پتھر

دیوانی روحیں
جس سے لپٹ کر روتی ہیں
وہ آسمان سے گر کر ٹوٹا
ایک مقدس پتھر ہے

ایوان

پیش از تکوین کی تاریکی
لے کے جلو میں بادِ طوفانی
کوندے چمکاتی آتی ہے

جشن تولد
سنگ و خشت سے ساختہ اک ایوان
جس کے احصار تحفظ میں
گونجتا ہے
شور مبارکبادی کا
غرّش میں جو اک بادل کی
یوں دب جاتا ہے جیسے
اک چیونٹی ہاتھی پاؤں تلے

شیشے سے اندھیرے کا چہرہ
کمرے کے اندر جھانکتا ہے
عجلت سے جس کی کھڑکی پر
پردوں کو خائف ہاتھ گراتے ہیں، باہر
گردِ ایواں دیواروں اور دروازوں کو
پیٹتی ہے پرغیظ ہوا

چنگھاڑ لگاتا ہے طوفان
بنیاد سے ہلتا ہے ایوان
زنجیر آہن سے آویزاں
سہ شاخہ فانوس کی نبضیں ڈوبتی ہیں
کمرے میں آسیب اندھیرے کا
در آتا ہے

ہوتی ہے آواز بلند اک چیخ کی، نسوانی
مرد ہنسی ہنستا ہے، ہنسی کھسیانی
"میری عورت
تاریکی سے ڈرتی ہے!"
چھت، دیواروں، دروازوں پر
طوفاں کرتا ہے پتھراؤ
خوف سے عورت دفعِ بلا کے بولوں کی
اونچی آواز میں قرأت کرتی ہے

شمعدانوں میں مومی شمعیں
لرزاں ہاتھ چڑھاتے ہیں
تو نیم اندھیرے نیم اجالے میں
مجھ کو نظر آتے ہیں
کھالوں سے بدن اپنا ڈھانپے باہم یکجا
غار نشیں ترساں سائے

ان کی مشعل سے اٹھتا ہے
قرنوں کا دھواں
میں جس کے پردے کے پیچھے
دیوار غار پہ دیکھتا ہوں
سرّ ازل کی پرچھائیں جنباں

نقش، قدیمی،
کندہ ہیں دیواروں پر
منہ سے آوازیں پیدا کر کے لایعنی
وہ جن کو سجدہ کرتے ہیں

بجلی کے چمکتے لمحوں میں
وہ فرش غار پہ سحر زدہ دانتوں کا پانسہ پھینکتے ہیں
اور جھک کر اس کو پڑھتے ہیں

آسیب نما کالا بادل
غار میں ڈالے اپنا بھاری سر
آواز قدیمی اپنی دہرا دہرا کر
ان کو دہلاتا ہے

غیظ و غضب سے چھت پہ چڑھا
طوفان، ہراول اندھی طاقت کا
چھت کے کویلو نوچ نوچ کر(۱)
دائیں بائیں پھینکتا ہے

---

(۱) کویلو: کھپریل (چھت) کے کھپرے یعنی Tiles

بت

آنسوؤں کا غسل دے
اس بت کے پیکر کو جسے
تو نے محبت سے تراشا تھا کبھی
اور پھر
اس کو پائے سے گرا کر توڑ دے

کھویّا

جیسے دو بازو شکستہ
تہ سے اونچے سطح پر دریا کی
یہ پتوارِ دو
لڑتے ہوئے موجوں سے
جاتے ہیں کہاں؟

غالباً ان دور افتادہ سواحل کی طرف
کہ کھلی آنکھوں سے اپنی دیکھتا ہے جن کے خواب
آج بھی ان کا کھویا
زیرِ آب

دیوار

دل کے جنوبی رخ پہ کھڑی
چونے کی استرکاری سے
اجلی دیوار
کہ جس کے پار
گونجتا ہے پھولوں کے منڈل میں
بھونروں کا کالا گرداب

ایک سفر کے...

ایک سے دوسرا اگرچہ جدا ہے
ایک سفر کے سب ہیں ساجھی
کشتی دریا چپو مانجھی

نیم شب کا سماں

نیم شب کا سماں
ناریل کا شجر
جس کو پہچان کر
اس کی چھت پر رکا ہے
فسردہ قمر

دیر سے ہوں کھڑا
میں بھی دل میں لئے
گھاؤ اک درخشاں

ایک ویراں گلی
روح میں کھلبلی
اور ڈوبا اندھیرے میں اس کا مکاں
نیم شب کا سماں

تنہائی

نقشِ تنہائی سرِ شام ابھرتا دیکھوں
شاخِ دل پر
کوئی طائر نہ اترتا دیکھوں

بچہ

گھر کا پچھواڑا جس میں
وہ سوکھی گھاس پہ سوتا ہے
جھک کر ایک شجر پدرانہ
اس کے سر پر اپنا سایہ کرتا ہے

سن ہے اگرچہ اس کا کم
غیور بہت ہے اس کا غم
جب سارا گھرانہ سوتا ہے
وہ اپنا سر تکیے میں چھپا کر روتا ہے

مٹھی میں بھنچی ہوتی ہے اس کی
اک سوکھی ٹہنی
اور جیبوں میں ہوتے ہیں
کچھ سوکھے پتے
پلکوں پہ جمی اس کی مٹی کو
اس کے آنسو دھوتے ہیں

رات گئے بالین پہ اس کے بر پری جب آتی ہے
تو آنے والے ایک سہانے وقت کی لوری
اپنی رندھی آواز میں اس کو گا کے سناتی ہے

علم اسے یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو
اک جھوٹا خواب دکھاتی ہے

وقت

وقت تو ٹھہرا رہتا ہے
یہ تو ہم ہیں
جو کہ گذرتے جاتے ہیں

شبِ مہتاب

شبِ مہتاب تھی
ساحل پہ ہم دونوں گئے لیکن
ستارے سوختہ دیکھے
سمندر منجمد پایا

شکاری

موہوم خلا میں پر زن وہ
خود اپنی رفعت پیدا کرتا ہے
اور نابود سے ظاہر ہوتے طائر کے
خاکے کا تعاقب کرتا ہے

اس کے پیچھے
جُفت اس کا سایہ
اس کی پرواز کے پیچ و خم کو دہرا کر
رنگ و روغن اس میں بھرتا ہے

زندگی

ہے ابد کی اک جھلک
یہ زندگی
ایک پل جس کو دکھاتی ہے ہمیں
چمکا کے اپنے آئینے کو نیستی

ثمر

ہے سایہ پروردہ الم کا وہ شجر
جس سے تراوش دیکھتے ہو تم
طرب کا انگبیں

اک چیخ

جو ٹھوکروں میں تھی پڑی
اس چیخ کو
اپنا گلا میں نے دیا
اور یہ کہا، ''مت ضبط ہو
میرے گلے سے دلخراشانہ نکل۔''

وہ چیخ یوں چیخی مجھے
میں سن کے دیوانہ بنا
اس چیخ کا اک شامیانہ سا مرے سر پر تنا

میرا سکون روح سب جاتا رہا
وہ چیختی مجھ کو رہی میں اس کو چلاّتا رہا

ڈان کیہوٹی (۱)

چار آئینہ باندھے
سو کوس کے دم والے گھوڑے کو وہ
مہمیز سے ایڑ لگاتا ہے
ہاتھ میں اس کے نوگز کا اک نیزہ ہے
وہ نعرہ مار کے
پن چکّی پر حملہ کرتا ہے لیکن
پن چکّی کا چکّر کھاتا دشمن سایہ
اس پر چھاتا ہے

وہ پن چکّی کی سولی پر
ایڑی سے الٹا لٹکا چکراتا
اور دہشت سے چلّاتا ہے

---

(۱) سروانتیز (Cervantes) کا شہرۂ آفاق کردار Don Quixote

مسافر

صبح کے شیشے چمک چمک کر دھندلائے
شب کے مسافر جو کھوئے تھے
لوٹ کے نہ واپس آئے

کباڑی کی دکان

اک طرف ہے سوختہ تاروں کا ڈھیر
دوسری جانب
شکستہ اک کمانی کی طرح
یہ پیچ کھائی کہکشاں
اور ان کے درمیاں اوندھی پڑی
چاند کی بگڑی گھڑی
یہ آسماں ہے یا کباڑی کی دکاں؟

کاش

کبھی اے کاش ایسا ہو!
فلک سے پھوٹ کر چھوتی زمیں کو یہ شعاعیں
بہم ہو کر طلائی ساز اک ایسا بنائیں
حریری انگلیوں سے چھیڑ کر جس کو ہوائیں
وہی لے سرمدی ان کو سنائیں
ازل کے روز سے ہیں منتظر جن کی فضائیں

میں

میں حقیقت سے پرے
خود سے الگ، دور کہیں
پیکرِ خواب کی مانند کھڑا رہتا ہوں

جواں مرگ

(۱)

بازو سے پکڑ کر اس کو خلا نے
جب اپنے اندر کھینچا
پستی کی جانب سمت الراس سے
بدرِ کامل ڈھلتا تھا

سورج کے ساتھ گئی تھی وہ لیکن
اس کے ساتھ نہیں لوٹی
حسنِ ازل کی پا کر شاید اس میں جھلک
اس کو ابد نے روک لیا

جبڑوں میں چبا کر موت نے اس کو
دیکھو تم کو لوٹایا
جس دروازے نے اس کو اندر
زندہ نگلا تھا
اس نے سیڑھی پر اس کو باہر
مردہ اگلا ہے

(۲)

کاندھے سے موت کے تختے پر پٹکا
بے ڈول کریہہ المنظر یہ جثہ
کیا اس کا ہے؟

کیا یہ ہے وہی
جس کے ماتھے سے پھوٹتی تھیں
حسنِ یگانہ کی کرنیں؟
جو اپنے نیم تبسم سے
انسان کی روح کی تاریکی دھو سکتی تھی؟
جو تاج و تخت کی زیبندہ ہو سکتی تھی؟

جو چشم تصور میں شاعر کی
شعلہ شعلہ دکتی تھی،
جو پیکر پیکر چمکی تھی؟

تعبیر خواب تھا جس کا بدن مرمر جیسا
ہر دور میں سنگتراشوں کا
کہ جس کو جیتنے کی خاطر
صفحوں میں تاریخ کے ڈھیر لگا تھا لاشوں کا؟

کیا یہ ہے وہی
راگوں کے دل
جس کی آواز کے زیر و بم پر
ڈوبتے اور ابھرتے تھے؟
اٹھ کر باغ صوت میں جس کی آمد پر
موسیقی کے سرو کھڑے ہو جاتے تھے؟
کیا یہ ہے وہی؟

یہ وہ نہیں ہے یہ وہ نہیں
وہ تو ورا ہے... اور کہیں
مرگ و ملال و مایوسی کی اس دنیا سے ورا
ہم سے ورا اور خود سے ورا
یہ وہ نہیں!

وہ تھی جو رفعت کی طالب
قرب فلک میں پہنچی تو
تاروں نے اس کو جھک کے لیا
اپنی درخشاں بانہوں میں
اور روح روشن اپنی اس کے قالب میں پھونکی
اب قوسِ قزح کے رستے پر دیکھو
وہ جگمگ جگمگ کرتی ہے

محدود ظواہر کی دنیا سے
اشیا و اجساد کے عالم سے بالا
وہ تھی جس میں خود سے جدا
خود یافتہ ہے وہ اب اُس عالم میں
جو لامحدود ارواح کا عالم ہے
اب کاہکشاں سیار و ثوابت کا باطن
اس کے باطن میں شامل ہے
تاروں کے نغمے اب اس کے
شفاف گلے میں گونجتے ہیں

انسانی حسرت کے بُنے تانے بانے!

ہاں یہ وہ نہیں
ہونے کا عمل اس کا تکمیل کو پہنچا ہے
اور وہ جو اس سے پہلے تھی
ناقص اک سانچے میں ڈھلی
تیزاب فنا میں حل ہو کر
ہر لوث سے پاک ہوئی
اب اُس میں نہیں ہے کوئی دوئی
حسن اُس کا اب کامل ہے
اب وہ فرشتوں کے طبقے میں شامل ہے
(آگاہ ہے وہ ہم سب سے مگر
اس کی مافوق آگاہی میں

ہم شرکت کے اہل نہیں)
وہ رخشندہ اپنے نابود کی وسعت نا کی سے
محدود ہماری ہستی کو
جھک کے ترحم کی نظروں سے دیکھتی ہے
تب کیوں ہم اس کا سوگ مناتے ہیں؟

دیکھو!
بڑھ کر رضواں اُس پر
کھولتا ہے
جنّت کا دروازہ

دستِ غنودہ کے لکھے سب افسانے!

یہ اس کا جسد
ریوڑ کے سموں نے اس کو روندا ہو جیسے
تائید دہانِ زخم سے اپنے کرتا ہے کہ
یہ ہے وہی!

ہاں یہ ہے وہی
میں جانتا ہوں
سینگوں کو جھکائے اپنے ڈکراتا
موت کے ہنکارے پر نیچے اترا تھا
اُس کو کچلنے برج ثور سے

ریوڑ موت کے کالے بیلوں کا
اُس عالم کو بھی جانتا ہوں
کہ لاد کے اپنے کاندھوں پر مردوں کو جہاں لے جاتے ہیں
وہ اجساد و اشیا کی
چوڑی ہوتی فطرت کے سینے میں خاموش دراڑوں کی
اک اندھی بہری دنیا ہے
نوعِ انسانی کی جس کو پہچان نہیں
سینے پہ جہاں انسانوں کے
نابینا کیڑے رینگتے ہیں

(۳)

یاد ہے اس کی پیدائش کا دن مجھ کو
اور اس کا بچپن
پھیلا کر ہاتھ ہمکتی وہ گہوارے میں
چھوٹا سا فرشتہ لگتی تھی

ہستی و عدم کے بیچ مذبذب لمحے نے
ڈھل کر اس کے قالب میں
اپنا اظہار کیا
جب اس کا بنایا گہوارہ
تابوت بھی اک تیار کیا

اپنی کوکھ کے گھور اندھیرے میں
آغاز کیا اس کا جس نے
خود موت تھی کوئی اور نہ تھا
موت... کہ جو سایہ بن کر
ہر دم اس کے ساتھ چلی
اور وہ تنویم کی حالت میں جیسے
اپنی میت کاندھوں پہ دھرے
پیچھے پیچھے اس کے چلی
اس راہ پہ جو
دائیں مڑتی تھی اور نہ بائیں مڑتی تھی
بس سیدھ میں اپنی انگلی سے
قبرستان کی سمت اشارہ کرتی تھی

وہ تھی اک نازک پودا
ایک تن آور پیڑ کے نیچے روئیدہ
اس کی نمو سے جو غافل ہر دم
اس پر چھایا رہتا تھا

اپنے مہتابی باغ میں وہ پتوں میں چھپی
تھی ایسی کلی
سورج کے لبوں نے جس کو کبھی بوسہ نہ دیا
جوشِ نمو کے گونجتے موسم میں جس پر
آ کر نہ کسی دیوانے بھونرے نے گرداب کیا

ہاتھوں سے خزاں کے مزروعہ تھی اس کی زمیں
جس میں فقط کانٹے تھے اُگے
کہ جن کی نوک پہ اس کی خوں گشتہ ارمانوں کی
بوندیں کانپتی تھیں

نیم شبانہ چشم تپیدہ سے اپنی
وہ آب آشامی خوابوں کے ٹھنڈے چشموں سے کرتی تھی
اور امید کی کانپتی کرنوں سے
اپنے زخموں میں ٹانکے بھرتی تھی

(۴)

جب گھونگھے میں ڈال کے منھ
چیخی زور سے نام اس کا
ساحل کی آزاد ہوا
یا نغمہ بار اپنی وادی میں دور کہیں
اس کو بلانے پھولوں نے
اپنا بجایا نقارہ
تو گھبرا کر اس نے
اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے
اور سرخیز اپنے نغمے
اپنے گلے میں گھونٹ لئے

جب دورافتادہ بحر سے کوئی لہر اٹھی
جس نے اپنی انگشت آبی سے
ان دیکھی دنیاؤں کے خوابوں کی لکھیں
ریت پہ تعبیریں
یا جھاگ سے اُمڈا جام کیا اپنا اونچا
تو اس نے سفر آمادہ اپنے دل کو ایڑی سے کچلا
اور جا کے حصارِ زنداں میں اپنے محبوس ہوئی

ڈھونڈتی جب آئی اس کو
جنگل کی وحشی خوشبو
تو اپنے باطن کی شورش سے خوف زدہ
عود جلایا اس نے پیتل سوز میں اور
چوما چاندی کا پنجہ

وہ تنبیہی پیغام پڑھا اس نے
کہ جس کو نام اس کے
تحریر افق پر کر کے حروف سرخ میں شام گئی
اس نے دیکھا
سورج کا طلا کالا پڑتا
اور الٹتے
شب کو طشت ستاروں کا

اس کی کیاری کے پھولوں نے اپنا باطن

اس پر فاش کیا

جس میں وہ جب جھانکی تو

رنگوں کے کہرام کی تہ میں

اپنے مستقبل کی سیاہی چھپ کر بیٹھی

اس نے پہچانی لیکن

ماننے سے انکار کیا

تھا اس کو یقیں کہ

اس کی اعانت کو موجود ہمیشہ ہوں گے

اس کے روشن جسموں والے ائمہ

(۵)

جب تقدیر نے جھٹکا دے کر اس کی رتی کو

اس کو گرایا منہ کے بل

تو اس کی مدد کو نوری پیکر نہ کوئی آیا

البتہ موت نے لاد کے اپنے کاندھے پر

ٹھوکر سے کھولا دروازہ

اور اس کو دواخانے کے جلتے بستر پر پٹکا

موت نے اس کی پلکوں کے نیچے

کانٹے بوئے

تاکہ کبھی نہ وہ سوئے

اور اس کی ہراساں آنکھوں پر

باندھ کے گھور اندھیرے کی پٹی اُس سے
چھینی اس کی بینائی

موت نے اپنے آلے سے
سوراخ اس کے حلق میں کر کے
اس کا گلا بے صوت کیا
تا کہ وہ نہ بول سکے نہ چیخ سکے

(۶)

کروٹ لیتی خاموش اذیت پر
ڈال کے آخری ایک نظر
سورج کی شعاعیں رخصت ہوتی ہیں
وہ تاریکی میں اپنی سوکھتی آنکھوں کے پتھر
دہشت سے چیختے سنتی ہے

اس کے بے صوت گلے سے اک
چیخ کا سایہ اونچا ہو کر
سناٹے کی دیواروں سے اپنا سر ٹکراتا ہے

تاریکی میں نابینا
اس کے بدن کے چھالے آنکھیں کھولتے ہیں
اور پھٹ کر تکتا ہے اس کا لحم ملائم
دہن نما

اس کی کیاری میں، سوکھی'
پھولوں کی سانسیں اُکھڑی ہیں
اور گلے باہم لگ کر
روتے ہیں رنگ گلابوں کے

تیز دوا کی بجتی گھنٹی پر
کابوس کی کھڑکی کھلتی ہے
جس میں بھنکار کی گونج سے اندر آتی ہے
مانس مکھی
جو بیٹھ کے اس کے زخموں پر
اُن میں موت کے انڈے دیتی ہے
اور نیلاہٹ سے گھوم گھوم کر
کالا کالا شور مچاتی ہے

سیڑھی کے آخری زینے کے نیچے
کھُر مارتا مٹی میں پھنکار کے
موت کا کالا بیل کھڑا ہے باہر
ڈکراتا

آہنی قدموں کی آہٹ
وہ دالان میں گونجتی سنتی ہے

حسرت سے
اشکوں کے لب آبی اس کے
پتھراتے ہونٹوں کو اس کے چومتے ہیں
وہ سناٹے میں زنگ آلودہ کیلوں سے
دیواروں پر لٹکے طغرے
گر کے زمیں پر شور سے ٹوٹتے سنتی ہے

خون رگوں میں اس کے ہوتا ہے بھاری
اور ہوتی ہے اس پر طاری
موت کی سرشاری

(۷)

چادر پھیلائی موت نے اس کے آنگن میں
جس پر بیٹھی اس کی تینوں خالائیں
گوندھتی ہیں اشکوں کی مالائیں
اس کے بدن پر دلہن کا سنگھار نہ تھا

بلوریں گردن میں ہیروں کا ہار نہ تھا
ہیروں کی تجارت کرنے والو
اپنی دکانیں بند رکھو
اس کے اعزاز میں
آج کے دن
چادر پھیلائی موت نے اس کے آنگن میں

جھومر سے محروم تھی اس کی پیشانی
سونا نہ سنارو اپنی کٹھالی میں پگھلاؤ
آج کے دن
چادر پھیلائی موت نے اس کے آنگن میں

(۸)

کیا یافت تھی اس کی جب وہ اس دنیا سے گئی؟
بیوی نہ کسی کی

ماں
نہ کسی کی محبوبہ
تقصیر تھی شائد اس کی یہی
کہ وہ تھی فرشتوں جیسی پاکیزہ

(مستقبل کے آہن خانے میں
اس کے نازائیدہ بچے
اپنے سنگیں گہواروں میں
نیند ابد کے سوتے ہیں)

(۹)

تسلے میں دھوئے غسالہ نے ہاتھ اپنے
اور کفن میں لٹھے کے
اس کو لپیٹا موت نے پنے ہاتھوں سے

سرکا کے کفن مت اس کا چہرہ دکھلاؤ
منہ پھیرا اس سے ان آئینوں نے
جو تھے اس کے عکس کے دلدادہ
جذب ہوا پتھر میں وہ پانی
جس میں حسیں صورت وہ اپنی دیکھتی تھی
اب اس سے نہیں دنیا کو کوئی دلچسپی
اس پہ جھکے ہیں جو رشتے
وہ ہیں کچے دھاگوں سے بندھے
جو موت کو اس کی طول نہیں دیں گے
اور چند دنوں میں اس کو بھولیں گے

(۱۰)

میں سنتا ہوں
تابوت میں اس کے کیلیں ٹھونکی جاتی ہے

تپتی دھوپ کے کاندھوں پر
اس کا جنازہ اٹھتا ہے
گرمی سے مگر اب فرق نہیں پڑتا اس کو کیوں کہ
وہ موت کے مس سے ٹھنڈی ہے

کھود رکھا ہے گورکنوں نے اس کا گڑھا
دائم خالی ایک شکم
منہ جس کا کھلا ہے اس کو نگلنے کی خاطر

ہر نوعِ زندہ کی طرح

بستی میں عدم کی تازہ وارد اے دلہن!
تیرا عروسی حجلہ ہے یہ تیری لحد
اور عروسی جوڑا یہ براق کفن
ہے جس میں بسی کافور کی بو

(۱۱)

راوی ہے قبرستان کا رکھوالا
جب چاند فلک پر پورا ہوتا ہے
تو اس کی جسم بدر چھایا
قبر پہ جھک کر اپنا کتبہ پڑھتی ہے
اور بلند آواز سے گریہ کرتی ہے

اس کے حواس مختل کی تجسیم فقط

وہ جس زنداں کی قیدی ہے
کوئی دروازہ اس سے نہیں کھلتا باہر

منظور نہیں اس کو اپنا
اس دنیا میں نہ ہونا
سائے میں مبدل دیکھ کے خود کو ڈرتی ہے
وہ ہم میں واپس لوٹ آنے خواہش کرتی ہے

اک وہم کا مفروضہ کہ حقیقت جس کی کوئی نہیں
وہ مردہ ہے
اور تقدیر میں مُردوں کی لکھا ہے یہی
کہ ان کی موت دوامی ہے
کھینچی ہے موت نے ان کے ہمارے بیچ میں جو حدِ فاصل
پار نہیں کر سکتی وہ

ہر صبح کے آئینے میں دیکھنا چاہتی ہے وہ منھ اپنا
اتنا ہی حسیں جتنی وہ تھی

خارج فہرست شام و سحر سے اس کا نام ہوا
ٹھہری ہے موت کے ہندسے پر جا کر اس کی سوئی
دنیا میں نہیں اب اس کے حصے کا فردا باقی کوئی
آنکھیں تھیں حسیں جو اس کی کبھی
موت نے ٹھونس کے ان کے کٹوروں میں
اب مٹی بھر دی ہے

راوی ہے قبرستان کا رکھوالا
کہ چاند فلک پر جب پورا ہوتا ہے
تو اس کی جسم بدر چھایا
قبر پہ جھک کر اپنا کتبہ پڑھتی ہے
اور بلند آواز میں گریہ کرتی ہے

(۱۲)

اے دنیا سے زود گذر!
صحرائے عدم میں رکھ کے قدم
آگے بڑھنے سے مت ڈر
موت کا پھیلاؤ ہے ہستی کے پھیلاؤ تک
نابود میں تو لا فانی ہے

(۱۳)

اے اقلیم حسن کی سلطانہ
مشہور جہاں میں گرچہ تیرا نام نہیں
گو تیری لحد پر قصر کوئی ذی شان نہیں
میں پیش تجھے کرتا ہوں مگر
ناچیز اپنا یہ نذرانہ
تعمیر کیا ہے میں نے جسے
خشت و آب و گل سے نہیں بلکہ
سناٹے کی مٹی میں گوندھے لفظوں سے
(سناٹا وہ جذب ہے جس میں
نطق و بیاں کی گیرائی
کون و مکاں کی پہنائی
اور انسان کی سچائی
سناٹا جو بولنے پر مجبور ہمیں کرتا ہے مگر
دائم ناگفتہ رہتا ہے)

(۱۴)

اے سناٹے کی دلہن!
جس پتھر کی سل کے تلے تو سوتی ہے
وہ تیرے سفر کے کالے کوسوں کا
آخری پتھر ہے
جینے کے آزار سے تو آزاد ہوئی
گھبرا کر آنکھیں کھول نہیں
تجھ تک نہ پہنچ پائے گا کوئی اب تیرا عدو
پہرہ دیتا ہے تجھ پہ ابد
محفوظ ہے تو

اس آب و گل کی ڈھیری کو
جس کے اندر دفن ہے تو
میں دیکھنے دوبارہ نہ آؤں گا کیوں کہ
اب میرے دل میں ہے تیرا مدفن
میں، حسن کی دیوی، جس پہ ہمیشہ
جھک کے عقیدت سے تیری
یادوں کے پھول چڑھاؤں گا

ارمان

مرے تعمیر کے ارمان دل میں
رہ گئے ڈھے کر
نظر کے سامنے سے جب
شکستہ بام و در گذرے

جمعیت

سنبھل کر تم یہاں آگاہ ہونا
اپنی ہستی سے
کہ ان آفاق کی ساری جمعیت
بے خودی سے ہے

نگاہوں کی دنیا

ہے کچھ اس کے باہر؟
کہاں کس نے جانا
نگاہوں کی دنیا
مرا قید خانہ

ذوالقرنین(۱)

مرتعش کرہ فضا کا
ہے بلند
ہمہمہ کا شور برج ثور سے

نصف النہار
سر پہ ذوالقرنین کے
دائرہ اس کی تجلی کا عظیم
آقائے نور
کر کے ایوان تجلی سے ظہور
کس قصر عالی شان میں
جا کے کرتا ہے قیام
ہے تجسس اس کو دیکھے وہ مقام

پھیلا ہوا صحرا ہے تا حدِ نظر
تیار ذوالقرنین ہے بہر سفر
تاج دو شاخہ ہے اس کے زیب سر
(شرق کندہ ایک پر ہے دوسرے پر غرب ہے)

۱۔ لغوی معنی: دو سینگوں والا

وہ کڑی اپنی مسافت کر کے طے

جا کے رکتا ہے جہاں

ہے وہاں کیچڑ کا اک دریا رواں (۲)

بنتے ہیں جس کی سطح پر اور پھوٹتے ہیں

پُر تعفن بلبلے

جس پر جھکا اس کو نظر آتا ہے، زرد

دائرہ اپنے خدائے نور کا

جوابِ وجود سابقہ کا اپنے ہے

صرف ایک عکس داغ دار

ہاتھ اپنے کر کے اونچے

کھینچتا ہے اپنے اندر اس کو دریا کیچ کا

کچھ دیر جس کی سطح پر وہ دیکھتا ہے پھوٹتے

پُر تعفن بلبلے

تنگ تر ہوتا اندھیرے کا حصار

جس میں چمکتی ہیں فقط

اس کی آنکھیں شعلہ بار

نیم شب

اور ہے بلند

ہمہمہ کا شور برج ثور سے

۲۔ مغرب کا سفر طے کر کے پُر تجسس ذوالقرنین جب سورج کے مقامِ غروب تک پہنچتا ہے تو سورج کو کیچڑ کے ایک دریا میں ڈوبتا دیکھتا ہے (قصص القرآن)۔

خواہش

ہاتھ سے توڑ کے شیرازۂ اوراق اپنا
دور تک ان کو ہواؤں میں بکھرتا دیکھوں

ماندگی

مستعد رکھتی تھی اسکو
دن چڑھے سے شام تک اک جستجو
پر، ماندگی سے چور اب
وہ اٹھاتا ہے تھکے ہارے قدم

اس کے پیچھے ڈوبتا سورج ہے اور
اس کے آگے ریت پر
اس کی چھایا تیز رو
دمبدم ہوتی دراز
پہنچ جانا چاہتی ہو جلد تر
جیسے اس دہلیز پر
ختم ہوتی ہے جہاں ہستی کی حد
اور جس کے پار ہے
تابندہ اقلیمِ ابد

معمار

اپنی تعمیریں کب کی مکمل کر لیں
سب معماروں نے
اک تم کہ مگر اپنے سر پر
اب بھی سنگ و خشت اٹھائے پھرتے ہو

خوں رنگ کلی

تلوار نما
پیڑ کی جڑ تک
چیخ خزاں کی جب اتری
تو شاخِ خشک نے پیدا کی
ضبط جو اس نے اپنے اندر کر رکھی تھی
اک خوں رنگ کلی

مکان

سرخ اینٹوں کا مکان
اپنے چمکیلے پروں کو تول کر
اس کی چمنی پر اترتا
خنجروں سے لیس سورج...
مانگتا اپنے شکار

اس کو اشارے سے دکھاتا ہے مکان
خوف سے چھپتا ہوا
چارپائی کے تلے
کنبہ کوئی والا تبار

اک پیڑ کنارِ راہ کھڑا

اک پیڑ کنارِ راہ کھڑا
ہاتھوں میں لئے
شبنم سے بھرا
سبز کٹورا پتوں کا
حسرت یہ لئے اپنے دل میں کہ
پیاس بجھانے اپنی کبھی
اس کے پاس بھی آئے کوئی

وہ دیکھتا ہے لیکن رستہ
دور دور تک آج بھی ہے
ہر دن کی طرح
ویران پڑا
اک پیڑ کنارِ راہ کھڑا

بلاوا

دیکھو گے تم
ایک بحرِ بے کراں
بادباں آفاق کا تانے ہوئے
ہوگا بلاوا موجزن
آبِ زمرد رنگ کا
مت اس طرف آنا مگر تم زینہار!
ٹوٹے ہوئے اک خواب کا ساحل ہے یہ
ہشیار باش!
اس کی سنہری ریت میں
ہیں دبی گردن تلک وہ کشتیاں
ملاح جن کے چھوڑ کر اپنا وطن
مسحور پہنچے تھے یہاں
اب پتھروں کے ڈھیر میں
ہیں دفن ان کی ہڈیاں

زہرہ دیوی

☆

بجتے ہوئے اک تار پر
انگشت اپنی جس طرح رکھ دے کوئی
ہے یک بیک حرکت کا ہنگامہ خموش
ہے افق تا بہ افق
زرخیز سناٹا محیط
نزدیک ہے اس کی نموداری بسیط

ہے ہمہ تن گوش جیسے کائنات
شامیانہ نیلگوں تانے ہوئے ہے آسماں
اس کے استقبال کا

پردۂ شبکی پر آنکھوں کی (۱)
شعاعیں جو بناتی ہیں شبیہ
وہ ایک چھایا کی ہے
جو ہے رہگذارِ نور پر ساکت کھڑی
دوسرے ہی پل مگر
وہ انتشارِ نور میں تحلیل ہے

جو ابر تھا
آمد پہ اس کی شعلہ زن
وہ بجھ کے اب تاریک ہے

ا۔ پردۂ شبکی، Retina: آنکھ کا روشنی حساس (Light-sensitive) پردہ۔

اب پھر وہی پیروں کے نیچے ہے زمیں
اور وہی سر پر پرانا آسماں

دن رات کی ذلت وہی
پستی وہی
اب پھر عقوبت خانۂ ہستی وہی

برف پہاڑوں کی پگھلی ہے
گرمائی خطوں سے بدر
لوٹ رہے ہیں آبی طائر اپنے گھر
میں چھوڑ کے اپنی دنیا کو
تیری طرف کرتا ہوں سفر
زہرہ دیوی

تیری قلمرو کی سرحد پر آہ مگر
ہے برف جمی
میرے آگے سینہ تانے
برفانی تودے ہیں کھڑے

کہرے سے ڈھکی اس وادی میں
میں تجھ کو پکارتا ہوں لیکن
میری صدا کو دہرا کر
کہسار مجھے لوٹاتا ہے
اس سناٹے سے خوف مجھے آتا ہے

ہے دور افق پر اک برفانی چوٹی جو

نظروں سے مری اوجھل ہوتی ہے
اور نہ قریب آتی ہے
اوٹ سے اس کی رہ رہ کر
جو نیلی روشنی پھوٹتی ہے
کیا وہ تو ہے جو مجھ کو بلاتی ہے؟

مسحور تجلّی سے تیری
میں... تیرا جوئندہ
آیا ہوں پیچھے چھوڑ کے اپنی دنیا کو
یہ سوچ کے ڈرتا ہوں کہ کہیں
تو صرف مری بیدار آنکھوں کا خواب نہ ہو

بجلی کے لپکتے کوندے میں
تیرے قلعے کے کنگورے
میں نے چمکتے دیکھے ہیں
ملبوس اندھیرا دیونما
تیرے ہیکل کے دروازے پر
پہرہ دیتا ہے

آسماں پر روح سے خالی
مردہ تارے بکھرے ہیں

اس سنگیں گھاٹی میں جس پر
شب کا منشا نافذ ہے
میں اپنے زخمی ہاتھوں سے
پتھریلی ڈھلوان کی سیڑھی چڑھتا ہوں
(کہ ختم نہیں ہوتے جس کے زینے)

تو افراز پہ
استغنا سے
اپنے ہزار آئینوں کے ایوان میں سوتی ہے؟

یا ٹھکرا کر اپنے زندانِ علوی کو
ایک نشیبی وادی میں
بیدِ لرزاں کے جنگل میں
منہ اپنا چھپا کر روتی ہے؟

اے روح لامحدود محبت کی
کل پردہ آنکھوں کا ہٹا کر
میں نے جب تجھ کو ڈھونڈا تو
یہ دیکھا کہ
نور کی کرنیں تیرے حسن کامل کی
معمور فضائیں کرتی تھیں

زہرہ دیوی میں نے تجھ کو
بحر کے جھولوں میں پینگیں بھرتے دیکھا
اور شفق کے گلدستوں میں پھولتے تیرے رنگوں کو
میں نے ترا اجلا سایہ
چمکیلی سطحوں پر دنیا کی پڑتے دیکھا
اور چمک میں چڑھتے دریا کی تیرا چہرہ
زہرہ دیوی! میں نے دیکھا
کہ اپنی مدور گولائی سے
بحر کی موجیں تیرے حسن کی شان دکھاتی تھیں
کہساروں کی زنجیروں سے آگے
شام کی سرخی میں میں نے
تحلیل تجھے ہوتے دیکھا

میں نے ہوائے گرم کے جھونکوں میں
محسوس تری سانسوں کا لمس کیا
اور بہتے پانی میں سنی
تیری سرگوشی

آج مگر کیوں بحر کے جھولے خالی ہیں
اور چڑھتے دریا سے
کیوں تیرا چہرہ غائب ہے؟

دیکھتا ہوں میں صرف
فضا میں چکراتا
ایک بگولا برفانی
اور اس میں غائب ہوتی تیری پرچھائیں

سورج کی شعاعوں چاند کی کرنوں تاروں پر
جو دھر کر نازک اپنے قدم تھی محوِ سفر
وعدے کے مطابق وہ اپنے
آ پہنچی ہے
ہے مجھ کو یقیں
اس کے ملبوس کی خوشبو چو اطراف میں پھیلی ہے
بجلی کی چمک میں لہراتا اس کا پیکر
خود میں نے دیکھا ہے
ہے مجھ کو یقیں
وعدے کے مطابق اپنے وہ
آ پہنچی ہے

اس وقت ہے وہ گلزاروں سبزہ زاروں میں
چھٹکا کر اپنی پھول چھڑی
پھولوں کے بقچے (۱)
زردانوں سے بارآور کرتی ہے (۲)
اور لمس سے اپنے سبزینہ (۳)
پودوں میں پیدا کرتی ہے

۱۔ بقچہ: پھول کا بیضہ دان: Ovary ۲۔ زردانہ: پھول کا نرمادہ: Pollen grain
۳۔ سبزینہ: وہ مادہ جو پودوں کے سبز رنگ کا باعث ہوتا ہے: Chlorophyll

ہے مجھ کو یقیں
وعدے کے مطابق اپنے وہ
آپہنچی ہے

آہ مگر
اس نے کیا پھر مجھ سے حذر

تاروں کے جزائر ابھرے ہیں
دور دراز فضاؤں میں
قرب کا اس کے لمس نہیں ہے
سرد ہواؤں میں

واپس جاتی جو تیز قدم خیزی کی صدا میں سنتا ہوں
کیا اس کی ہے؟
منسوخ ہے ہر حرکت کا ہنگامہ
محرابِ فلک تاریک ہوئی
رات کے گونگے جنگل میں
دور بلند اک چیخ ہوئی

بند ہوتے اور کھلتے ہیں
شام وسحر کے دروازے لیکن
اس کے پیکر سے خالی ہوتے ہیں
میں کان لگا کر رستوں پر
اس کی آہٹ لیتا ہوں لیکن
اس کے قدموں کی چاپ مجھے
صدیوں دور سنائی دیتی ہے

میں جانتا ہوں
محدود نہیں ہوگی اس کی آمد
وہ چو اطراف سے آئے گی
تب اس لمحے
آفاقی کرّوں کی حرکت
اپنے مدارِ دوری پر رک جائے گی

میں طغرائی اشکال کی گلکاری سے دیکھ
سجائے بیٹھا ہوں
اپنے دیوار و در
دل کی طرح یہ میرا گھر بھی

تیری امانت گاہ ہے، آ
گر یہ نہ منافی تیرے شکوہ حسن کے ہو تو
حسن کی دیوی
آ کے کسی دن
اس میں قدم رنجہ فرما

اے سخت گیر و سخت خو
دوست میری، اور عدو
کس بعد میں خلوت کئے بیٹھی ہے تو؟
توڑ دے اپنی خموشی
اور کسی دن
کر حقیقت مجھ پہ اپنی آشکار
میں کر رہا ہوں دیکھ تیرا انتظار

پردۂ اخفا اٹھا دے
اور مرے نزدیک آ
تاکہ اجلے پیر تیرے آنسوؤں سے دھو سکوں
اور فنا کر کے خودی اپنی
ہمیشہ کے لئے
تابعِ فرمان تیرا ہو سکوں

گر ہے مجھے اس کا یقیں
میرے تخیل سے کہیں باہر نہیں تیرا وجود
تو ڈھونڈتا رہتا ہوں کیا
شام و سحر
آفاق پار؟
باندھ کر تیرا تصور
کس لئے کرتا ہوں تیرا انتظار؟

تیرے زیرِ حکم کیوں لگتے ہیں مجھ کو
یہ زمین و آسماں؟
کیوں سلگتے حاشیے پر ابر کے
ملبوس کا تیرے گذرتا ہے گماں؟
تیرا اشارہ کیوں مجھے لگتا ہے
کوندا برق کا؟
اور لگتا ہے مجھے توسیع تیری ذات کی
بسط غرب و شرق کا؟
کیوں مجھ کو آتا ہے خیال
زیر و زبر ہے بحر کا سینہ تیرے انفاس سے؟
اور فیض سے تیرے ہی ہیں

کھلیان غلے سے بھرے

پودے ہرے؟

تیرا ہے تالیف ضیائی کا عمل (۱)

ہے تو ہی معطی

اور عطیہ ہیں ترا

پھول اور پھل؟

کیوں مجھے بے چین رکھتی ہے سدا یہ آرزو

کہ میرے بکھرے نظم کی

شیرازہ بندی کو کسی دن آئے تو؟

گر ہے مجھے اس کا یقیں

میرے تخیل سے کہیں باہر نہیں تیرا وجود؟

۱۔ تالیفِ ضیائی: Photosynthesis وہ عمل جس سے پودے سورج کی روشنی کو کیمیائی توانائی میں تبدیل کر کے اپنی غذا بناتے ہیں۔

اے غیبی دنیا کی مکیں
میں اپنی ان بینائی کھوتی آنکھوں سے
افلاک کے روشن حصّوں میں
تجھ کو ڈھونڈتا رہتا ہوں

تیری نیم تجلّی نے
مجھ میں جو حرارت پھونکی تھی
وہ میں نے کھو دی ہے
اب چھوتی ہے جب میرا بدن
جاڑے سے کانپنے لگتی ہے سورج کی کرن

مہلک ہے یہ جاڑا زہرہ!
آ کر اس سے مجھ کو بچا
یا اپنے عدم میں ساتھ مجھے آ کر لے جا

جب اک لمحہ
آسمان کے لاجورد سے
قطرہ بن کر تیرے لبوں پر ٹپکے گا
اوران پر ایک طلائی پھول کھلائے گا
مژدہ کی طرح جس کی خوشبو
چار اطراف میں پھیلے گی
اور تو تخصیص سے میرا نام پکارے گی
تو تیرے بلانے پر اس دم
کیا تیری طرف میں آؤں گا؟
یا تیری شاداں خنداں آنکھوں سے
ڈر کر پیچھے ہٹ جاؤں گا؟

میں اس لمحے سے ڈرتا ہوں زہرہ دیوی
جب دیکھتی تو رہ جائے گی
اور تیری خنداں شاداں آنکھوں کے آگے
گھور اندھیرا میرے دیرینہ غم کا
ثابت سالم مجھ کو نگل جائے گا

دل بجھ کے مرا رہ جاتا ہے
جب بھی تو میرے خوابوں میں
شادان و خنداں آتی ہے

اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر آیا کر
زہرہ دیوی
غمگین مجھے تو بھاتی ہے

کیا سہو ہے میرا کہ اس کو
میں ڈھونڈتا ہوں
کہساروں سبزہ زاروں اور
گلزاروں چاند ستاروں میں؟
کیا مجھ کو ڈھونڈنا چاہیے اس کو
گلیوں اور بازاروں میں؟

آہ مگر جب سوچتا ہوں ڈر جاتا ہوں
کہ اپنی رخشاں رفعت سے
جب وہ نیچے آئے گی
تو تابِ حقیقت لائے گی؟

اے امثال کے بالا عالم کی ہستی!
نیچے نہ اتر
تیرے شایان شان نہیں
یہ بدصورت دنیا اور اس کی یہ پستی
جو غیب کا پردہ تجھ میں مجھ میں حائل ہے
اس کو نہ اٹھا
ہے مضمر مجھ سے دوری ہی میں تیری بقا
زہرہ دیوی

طمع مسرت تھی مجھ کو
اس سے پہلے
اب غم کے تموّل پر اپنے میں نازاں ہوں
زہرہ دیوی

کل اک سرگرداں مجمع میں
غیر زمینی صورت اک میں نے دیکھی کہ
دیکھ کے جس کو بے ترتیب ہوئی
میرے دل کی دھڑکن
اک بوسیدہ چادر میں لپٹا
وہ اس کا کندن سا بدن

میں تیز قدم ہمدوش ہوا اس کے تو معاً
میری طرف موڑا اس نے اپنا چہرہ
سورج کی چمک سے جیسے آنکھ بچانے کو
جب میں نے ہاتھ اٹھایا تو دیکھا
وہ چشم زدن میں غائب تھی اس مجمع میں
(جیسے بہاؤ میں اک گدلے دریا کے
موج اک اجلے پانی کی)

دل کی تہوں میں میرے اذیت رینگتی ہے
میں سوچتا ہوں
کہ اک بوسیدہ چادر اوڑھے غیر زمینی وہ ہستی
کیا میری زہرہ دیوی تھی؟

اظہار تشکر

میں امریکہ میں اپنے ادبی سماج کے روابط و وسائل سے منقطع بوجوہ اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ اپنی کتاب کہاں چھپواؤں۔ فون پر جب میں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے سامنے اپنی الجھن پیش کی تو انہوں نے اپنے ناخن گرہ کشا کی ایک جنبش سے میری الجھن یہ کہہ کر سلجھا دی کہ 'تم اپنا مسودہ مجھے بھجوادو میں اسے یہاں چھپوانے کا انتظام کردوں گا۔' اقتضائے اظہار اور الفاظ کے مابین جو فصل ہے اسے جب کوئی کبھی نہ پاٹ سکا تو میری کیا بساط۔ لہٰذا فاروقی صاحب کی زیر نگرانی اشاعت کی منزل کو پہنچی ہوئی اس کتاب کے بارے میں میرے دل میں ان کے لئے جو جذبات تشکر موجزن ہیں ان کے خاطر خواہ اظہار میں میں خود کو قاصر و معذور پاتا ہوں۔

یہ بات میرے عجز بیان کی مشکل کو دو چند کر دیتی ہے کہ ان کی یہ عنایت و اعانت کوئی استثنائی واقعہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی مختصر و مخصوص دوران زمانی تک محدود ہے، بلکہ یہ صرف ایک مثال ہے ان کی نوازشوں کی جن کا سلسلہ فاروقی صاحب سے میرے تعلق و تعامل کی پچھلی ایک دہائی پر محیط ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب میں نے فاروقی صاحب سے سنہ ۲۰۰۵ میں رابطہ پیدا کیا اور انھیں اپنا پہلا مجموعۂ کلام 'دوسخنہ' بھیجا (جس کو میں نے بعد میں اپنے مجموعے 'بجھے رنگوں کی رونق' میں ضم کر دیا)۔

اس وقت تک میری صرف چند ہی نظمیں چھپی تھیں اور وہ بھی کراچی کے 'صریر' میں۔ دوسرا رسالہ 'تشکیل' تھا لیکن اس کے مسلسل معرض التوا میں ہونے کے سبب میری نظمیں اس میں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے جب اس کا ذکر فاروقی صاحب سے کیا تو انھوں نے مجھے کہا کہ میں اپنی نظمیں انھیں بھیج دوں۔ میں نے یونہی کیا۔ فاروقی صاحب میری فرستادہ نظموں اور ان کے عندیہ پر بار بار قسط بہ قسط بھیجی ہوئی میری دیگر نظموں کو بھی باقاعدہ ہندوستان کے مختلف جرائد میں شائع کرانے کا

اہتمام کرتے رہے۔ لہٰذا میری شاعری کو غیب سے بعرصۂ شہود لانے میں فاروقی صاحب نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ یوں بھی ہوا کہ انھوں نے میری کسی نظم میں کسی سہولسانی کی نشاندہی کی تو اسے میں نے درست کیا، لیکن یوں بھی تھا کہ جب کسی نظم میں انھوں نے کوئی ترمیم تجویز کی تو اس کے بارے میں کوئی قطعیت پسندانہ روّیہ اختیار نہیں کیا، بلکہ مجھے اختلاف رائے کی پوری آزادی دی۔ انھوں نے میری شاعری کے دونوں مجموعوں کو قبل و بعد اشاعت خبرنامہ شب خون میں طویل عرصے تک مشتہر کیا اور انھیں اپنی فہرست کتب میں ہمیشہ شامل رکھا۔ گذشتہ کئی برس سے وہ میری گذارش پر برابر اپنے کتب خانے سے مجھے کتابیں بھی بھجواتے رہے ہیں۔ الغرض مجھ پر ان کی مہربانیاں فوق الشمار ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی میرے ادبی سفر میں پچھلے دس گیارہ برس سے میرے مربی اور رہنما تو ہیں ہی، لیکن وہ میرے ایک مشفق دوست بھی ہیں جو مجھے سفر و حضر میں یاد رکھتے ہیں۔ مثلا سنہ ۲۰۰۸ میں جب وہ University of Texas, Austin کی دعوت پر امریکہ تشریف لائے تو مجھے بطور خاص اپنے مدعوئین کی فہرست میں شامل کیا۔ یوں پہلی بار مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان دنوں میری ان سے جو صحبت رہی اس کی یاد میرے لئے ایک متاع گراں بہا ہے۔

ٹائگر، ٹیکسس، جون ۲۰۱۵ء

آصف رضا

آصف رضا ہندوستان کے مشہور شہر امراوتی میں سنہ ۱۹۴۲ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۵۰ میں وہ اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ وہ عرصے تک زرعی یونیورسٹی لائل پور (فیصل آباد) میں پڑھاتے رہے۔ پھر وہیں سے سماجیات میں ایم۔ ایس۔ سی کیا اور پھر سنہ ۱۹۷۵ میں ایک فیلوشپ پر سماجیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لئے امریکہ گئے جس کے بعد انھوں نے وہیں کی شہریت حاصل کر لی۔ امریکہ میں وہ سنہ ۱۹۸۶ سے سنہ ۲۰۱۳ تک سماجیات کے استاد رہے، پہلے الی نائے (Illinois) کی ایک یونیورسٹی میں اور بعد میں ٹیکسس (Texas) کے ایک سینیئر کالج میں۔ وہ سنہ ۲۰۱۳ میں ریٹائر ہوئے اور اب ٹیکسس کے شہر ٹائلر (Tyler) میں مقیم ہیں۔

آصف رضا کی دو کتابیں "بجھے رنگوں کی رونق (مجموعۂ کلام)، اکادمی بازیافت، کراچی، پاکستان اور تنہائی کے تہوار (مجموعۂ کلام)، شہرزاد، کراچی پاکستان سے منظر عام پر آ چکی ہیں۔ یہ کتابیں پاکستان کے کتب فروشوں کے علاوہ ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی اور شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد سے مل سکتی ہیں۔

Printas Printing Services

#5, Kareem Market Nazimabad #2
Karachi, Pakistan.
Tel: 0335-2924993, 0300-9278869
Email: salisarwar@live.com